PDF Compressor Free Version

زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

نائب صدور

جناب سلطان اختر

ڈاکٹر اعجاز علی ارشد

مدیر

مشتاق احمد نوری

سکریٹری، بہار اردو اکادمی

Mob. 09431080070

معاون مدیر

انوار محمد عظیم آبادی

جلد : ۳۷ شمارہ : ۲

فروری ۲۰۱۶ء

زرتعاون : دس روپے

سالانہ : سو روپے

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ : سکریٹری بہار اردو اکادمی، اردو بھون، چوہٹہ، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ (بہار)

''زبان و ادب'' میں شائع ہونے والی تحریروں میں ظاہر کی گئی مصنفین کی آرا سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

email : zabanoadabbua@gmail.com
buapat2014@gmail.com

فیکس/فون: 0612-2678021 - 2301476

Web : www.biharurduacademy.org

کمپوزنگ : پروین اشرفی

تزئین : زیا پروین

PDF Compressor Free Version

ترتیب

اداریہ	حرف آغاز	مشتاق احمد نوری		۲
مقالات	بہار میں جدید اردو غزل: آزادی کے بعد	ڈاکٹر مشتاق احمد		۵
	معین الدین درد کی شعری خدمات	پروفیسر ظفر حبیب		۱۳
	سہیل عظیم آبادی کی مکتوب نگاری	پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی		۱۸
	راسخ عظیم آبادی کا رنگ تصوف	کوثر مظہری		۲۱
	فصیح الدین بلخی کے تاریخی کارنامے	ڈاکٹر سید احمد قادری		۲۵
	علیم اللہ حالی: چھٹی حس کا شاعر	ڈاکٹر اقبال واجد		۲۷
	اردو میں شعری وادبی سرقہ	ڈاکٹر سید ارشد اسلم		۳۲
افسانے	بیچ بھنور ندیا گہری	نورالحسنین		۳۷
	احمد انکل کے بچوں کا کیا ہوا؟	امین صدرالدین بھایانی		۴۳
	خلیج	اقبال سلیم		۴۸
	میں لوٹ آؤں گی کل	احمد کلیم فیض پوری		۵۲
منظومات	حمد پاک / نعت شریف	شنکر کیموری		۵۶
	غزلیں	شہپر رسول		۵۷
	غزلیں	راشد طراز		۵۸
	غزلیں	شمیم قاسمی		۵۹
	غزلیں	پروفیسر شاداب رضی		۶۰
	غزلیں	سلیم انصاری		۶۱
کتابوں کی دنیا	شاعر گمنام	ابونصر فاروق صارم عظیم آبادی	مبصر: زبیر احمد بھاگلپوری	۶۲
	ذکر کچھ چراغوں کا	فہیم بسمل	مبصر: ظہیر انور	۶۳
	بلند کردار لوگ	کبیرالدین	مبصر: شرف الہدیٰ	۶۴
ہماری سرگرمیاں	بتیا میں "اکادمی آپ تک" پروگرام کا شاندار انعقاد			۶۶
	اکادمی کے زیر اہتمام بیدی اور عصمت چغتائی پر شاندار قومی سیمینار			۶۷
	اکادمی میں بیت بازی کا کامیاب پروگرام			۶۸
	بہار اردو اکادمی میں رسم پرچم کشائی			۶۹
سلام و پیام	کرشن بھاوک، گل آفریں، شبانہ عشرت، نذیر احمد یوسفی، ارشد قمر، شکیل سہسرامی، اسلام احمد شاہی، گل فشاں حیدر،			۷۰

بچوں کا زبان وادب

PDF Compressor Free Version

اداریہ

حرفِ آغاز

بہار ایک ایسا صوبہ رہا ہے جہاں اردو کو ہر دور میں پھلنے پھولنے کا موقع ملا ہے۔ چاہے شاد عظیم آبادی کی شاعری ہو، قاضی عبدالودود کی تحقیق ہو، کلیم الدین احمد کی تنقید ہو یا سہیل عظیم آبادی کا فکشن ہو، ہر صنف میں بہار کو ہمیشہ ایک امتیاز حاصل رہا ہے اور کوئی اس سچائی سے بھی انکار نہیں کرسکتا کہ اردو رسائل و جرائد کی سب سے بڑی منڈی بہار ہی ہے۔ اس کے باوجود کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ بہار میں اردو قارئین کی تعداد آئے دن گھٹتی جارہی ہے اور نئی نسل کے لوگوں کا رشتہ اردو سے کمزور ہوتا جارہا ہے۔ سچائی یہ ہے کہ اردو سے ہمارا تشخص قائم ہے، ہمارے سارے دینی اثاثے اردو میں ہیں۔ آج کی نسلوں کو اردو کے کلاسیکل سرمائے سے لے کر موجودہ ادب تک توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

سرکار اردو کے تئیں مخلص ہے، اردو اساتذہ بھی بحال ہو رہے ہیں۔ اردو پڑھنے والوں کو مختلف عہدوں پر جگہ بھی دی جارہی ہے، اردو سے وابستہ بچوں کو سرکار اعلیٰ تعلیم کے لئے بھی قرض کی صورت میں خطیر رقم دینا چاہتی ہے، لیکن پھر بھی آج اردو صرف متوسط طبقے کی زبان ہو کر رہ گئی ہے۔ بورژوا طبقہ کے لوگ اپنے بچوں کو اردو تعلیم دلوانے میں عار محسوس کرتے ہیں جب کہ وہ دیگر مضامین کے لئے اچھی خاصی رقم ٹیوشن پر خرچ کرتے ہیں، حالانکہ اس سے چوتھائی رقم میں عربی اور اردو پڑھانے والے اساتذہ مل جاتے ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے بچوں کی اردو تعلیم پر خاطر خواہ توجہ نہیں دیتے۔ آج ہمارے معاشرے کی صورت حال کچھ ایسی ہے کہ جو متوسط طبقہ ہے، وہ اپنے بچوں کو عربی اور اردو کی تعلیم دینے کا نظم کرتا ہے اور اس طبقے کے نیچے کے بچے مدارس میں بھی تعلیم حاصل کرتے ہیں، جہاں اردو کی بھی تعلیم ہوتی ہے، مگر ایک بڑا طبقہ اس کی طرف دھیان نہیں دیتا۔

اردو کے مسائل پر بڑے طبقوں کے یہاں عام طور پر خوبصورت ڈرائنگ روم میں تبادلہ خیال کئے جاتے ہیں اور بڑی بڑی بحث ہوتی ہے، لیکن وہ عملی طور پر کچھ نہیں کرتے۔ ان کے گھروں میں انگریزی اور ہندی کے اخبارات تو آتے ہیں، لیکن ان کے یہاں اردو اخبار لینا کسر شان سمجھا جاتا ہے۔ جب تک اردو گھر گھر کی زبان نہیں ہوگی تب تک اس کا فروغ ممکن نہیں ہوگا۔ اردو کے مسائل کی باتیں کرنے سے ان کا حل کبھی نہیں نکل سکتا، اس کے لئے سنجیدہ فکر اور عملی اقدامات ضروری ہیں۔

پہلے کے دور میں اردو زبان مسلمانوں کے علاوہ دیگر مذاہب کے لوگ بھی جانتے تھے۔ اردو زبان ان کے لئے ذریعہ اظہار تھی، لیکن اب یہ عالم ہے کہ اردو کو ہمارے ہی گھروں سے نکالا جارہا ہے، اردو کے فروغ کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ ہر گھر میں اردو بولنے اور پڑھنے کا رواج عام کیا جائے۔ دیگر زبانوں کے اخباروں کے ساتھ اردو اخبارات و رسائل بھی خرید کر پڑھے جائیں اور بچوں کے لئے ان کے والدین اور

PDF Compressor Free Version

سرپرست دلچسپ اردو کتابیں مہیا کریں تا کہ بچوں کو اردو خوانی سے دلچسپی ہو اور انہیں اس کی عادت بنے۔ ہر گھر میں اور ہر فرد کے ذریعہ اردو کو اپنی تہذیب وتمدن سے جوڑنے کی کوشش ہو، اپنی ضروریات زندگی میں اردو کا استعمال ہر جگہ کیا جائے اور اپنی دوکانوں کے نام اردو میں بھی لکھے جائیں۔ سچائی یہ ہے کہ غیر مسلم دوکاندار مسلم گاہکوں کو متوجہ کرنے کے لئے اپنی دوکانوں کے نام اردو میں بھی لکھواتے ہیں، مگر ایسا کرنا ہم اردو والے عار سمجھتے ہیں۔

اردو کی تعلیم کو عام کرنے کے لئے ایک منظم کوشش درکار ہے اور تعلیمی نظام سے وابستہ اداروں کو اس سلسلے میں سنجیدگی سے عملی اقدامات کرنا اور اس پر مسلسل توجہ دینا چاہئے۔ وزیر اقلیتی فلاح محترم جناب ڈاکٹر عبدالغفور اس سلسلے میں کوشاں ہیں اور انہوں نے اردو لائبریریوں کے ذریعہ اس تعلیمی نظام کو ایک نئی شکل دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کے مشورے کی روشنی میں بہار اردو اکادمی نے کئی اقدام اٹھائے ہیں، جن میں بہار کی اردو لائبریریوں کا اردو اکادمی سے الحاق کرنا بھی شامل ہے۔

بہار اردو اکادمی سے جن لائبریریوں کا الحاق ہوگا، انہیں کتابوں کی مدد کے علاوہ کچھ رقم بھی دی جائے گی اور انہیں اس بات کی ہدایت بھی دی جائے گی کہ وہ اپنی لائبریری میں صبح یا شام کے اوقات میں بچوں کے لئے عربی اور اردو تعلیم کا بھی نظم کریں اور اعزازیہ دے کر کسی مناسب آدمی کو عربی اردو پڑھانے کے لئے تیار کریں۔ اعزازیہ کی یہ رقم بہار اردو اکادمی سے ادا کی جائے گی۔ اس طرح اگر بہار کی سبھی اردو لائبریریوں کو، اردو اکادمی سے جوڑ دیا جائے تو بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ ہر گاؤں میں اردو پڑھانے کا ایک اضافی مرکز مہیا ہو جائے گا اور جو بچے اردو اور عربی سے نابلد ہیں انہیں اردو لائبریری کے ذریعہ اردو اور عربی کی تعلیم سے بہرہ ور ہونے کا اور کتابوں کے مطالعہ کی عادت بنانے کا پورا پورا موقع ملے گا، جس کے دیرپا اور دوررس نتائج یقینی ہیں۔

ہر اچھے کام کی شروعات اپنے گھر سے ہی کی جانی چاہئے۔ ہر شخص اگر اردو کی محبت اپنے دل میں بسالے اور اردو زبان کے فروغ کے لئے اپنے طور پر کچھ کوشش کرتا رہے تو پھر ہم بہت جلد ایک خوشگوار تبدیلی کا احساس کر پائیں گے۔

آیئے! ہم سب اس بات کا عہد کریں کہ ہم اپنے بچوں کو عربی و اردو تعلیم سے بہرہ ور کریں گے اور اردو زبان کو کبھی نہیں مٹنے دیں گے کیونکہ اگر یہ ختم ہوئی تو ہم اپنے تشخص سے محروم ہو جائیں گے۔

PDF Compressor Free Version

ڈاکٹر مشتاق احمد
پرنسپل ماروازی کالج، دربھنگا

بہار میں جدید اردو غزل: آزادی کے بعد

امریکن شاعر ویلیم کلن براینٹ (William Cullen Bryant) جو انیسویں صدی کا ایک معروف رومانی شاعر ہے اس نے اپنے مجموعہ کلام ''فوارہ اور دیگر نظمیں'' (۱۸۸۲ء) میں لکھا ہے کہ شاعری کو قدیم اور جدید کے خانے میں تقسیم کرنا احمقانہ رویہ ہے اور اس نے دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ فنکار اپنے عہد کا آئینہ دار ہوتا ہے اسی لئے اس کے فکری نتائج کو اس عہد کے تناظر میں دیکھا جانا چاہئے جس عہد کی وہ پیداوار ہے۔ تین (Tain) نے بھی اپنی مشہور زمانہ کتاب ''فلاسفی آف آرٹ'' میں اس سچائی کو اجاگر کیا تھا کہ فن کوئی ایسی شئے نہیں جو اپنے ماحول سے منقطع اور بے نیاز ہو، لہٰذا اسے سمجھنے کے لئے ہمیں اس عہد کے ذہنی اور معاشرتی حالات و محرکات کا لازمی طور پر مطالعہ کرنا ہوگا جو اس کی تخلیق کا باعث ہوئی ہے۔ غرض کہ کسی بھی فن پارے کے ادوار ی مطالعے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس عہد کو بھی نگاہ میں رکھا جانا چاہئے جس عہد کی وہ تخلیق ہے۔ جہاں تک بیسویں صدی کا سوال ہے تو یہ صدی علم و حکمت، شعور و آگہی بصیرت و بصارت اور دانشوری کی صدی رہی ہے، لیکن ساتھ ہی یہ صدی عالمی سطح پر سماجی، معاشرتی، سیاسی، ثقافتی اور تہذیبی شکست و ریخت کی بھی صدی رہی ہے۔ بالخصوص برصغیر کے لئے تو یہ صدی کشمکش حیات کی صدی رہی ہے۔

جیسا کہ پہلے ہی ذکر آچکا کہ فنکار اپنے عہد کا پروردہ ہوتا ہے اور وہ اپنے گرد و نواح میں ہونے والی تبدیلیوں سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔ غرض کہ تغیر زمانہ کے ساتھ انسان کی زندگی کے تصورات اور افکار و نظریات بھی بدلتے ہیں، اس لئے جب ہم نصف بیسویں صدی پر سرسری نگاہ ڈالتے ہیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اس صدی میں افکار و نظریات کی دنیا میں ایک بڑا انقلاب پیدا ہوا اور جہاں تک اردو شاعری کا سوال ہے تو اردو شاعری کے لئے یہ صدی تو اور بھی زرخیز ثابت ہوئی ہے کہ تحریکات کے حوالے سے اگر غور کریں تو ترقی پسند تحریک، حلقہ ارباب ذوق اور جدیدیت نے تو اردو شاعری کی دنیا ہی بدل دی ہے۔ جیسا کہ پروفیسر قمر رئیس نے لکھا ہے کہ:

> ''اس عہد میں فکر و احساس کی نئی اور توانا لہروں کے سہارے زندگی کی بدلتی حقیقتوں کو زیادہ عقلی اور معروضی زاویے سے دیکھنے اور سمجھنے کا شعور پیدا ہوا۔''

چوں کہ میرے عنوان کا تقاضا یہ ہے کہ میں اپنی گفتگو کو بہار میں جدید اردو غزل، آزادی کے بعد تک محدود رکھوں، اس لئے یہاں مزید تمہید کی گنجائش نہیں۔

میرے خیال میں غزل اردو کی محبوب صنف سخن بھی ہے اور مظلوم بھی۔ محبوب اس معنی میں کہ اردو کا شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس نے غزل کی زلف گرہ گیر کو سنوارنے کی کوشش نہ کی ہو اور مظلوم اس معنی میں کہ ہماری تین سو سالہ شعری روایت میں محض گنتی کے ایسے شاعر ہوئے ہیں جنہوں نے تقاضائے غزل کی پاسداری کی ہے۔ بلاشبہ غزلیہ شاعری نہ صرف خون جگر چاہتی ہے بلکہ صحرا نوردی کی بھی متقاضی ہے۔ چوں کہ ہماری غزل کے بیشتر شعرا پیش پا افتادہ مضامین سے استفادہ کر کے غزل کی دنیا آباد کرتے ہیں، اس لئے اچھے سے اچھے غزل گو شعرا کے یہاں بھی غزل کے بولتے ہوئے اشعار کی کمی کھٹکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ولی دکنی سے لے کر شہریار تک غزل کے شاعر کو ہم انگلیوں پر گن سکتے ہیں۔ ترتیب میں ناقدین کی ترجیحات ایک دوسرے سے الگ ہو سکتی ہیں، لیکن ولی کے عہد میں فائز، میر کے عہد میں سودا اور درد، عہد غالب میں غالب کے علاوہ ذوق و مومن، پھر لکھنؤ کی طرف نگاہ ڈالئے تو ناسخ و آتش اور عظیم آباد میں شاد کے علاوہ کتنے غزل گو ہیں جو اب تک مثالی ہیں۔ اقبال کے بعد، جگر، اصغر، کلیم عاجز، پرویز شاہدی،

PDF Compressor Free Version

فیض، فراق، ناصر کاظمی، ساحر، شہریار، احمد فراز، حسن نعیم، مجروح سلطانپوری وغیرہم نے غزل کی نہ صرف آبرو رکھی بلکہ دنیائے غزل میں چار چاند بھی لگائے۔ آپ اس فہرست میں چاہ کر بھی دو چار نام سے زیادہ کا اضافہ نہیں کر سکتے۔ اس کا مطلب قطعی یہ نہیں ہے کہ بقیہ شعرا کی شاعری قابل اعتنا نہیں ہے۔ میرے کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ غزلیہ شاعری کو ہم نے جتنا آسان سمجھ رکھا ہے اتنی یہ آسان صنف نہیں ہے۔ صرف قافیہ اور ردیف پیمائی عروضی تقاضے کو تو پورا کر سکتی ہے، لیکن موضوعی اعتبار سے غزل کا شعر نکالنا صحرا میں کشتی چلانے کے مترادف ہے۔ شاید اسی حقیقت کا احساس اردو کے نامور ناقد پروفیسر آل احمد سرور کو تھا کہ انہوں نے غزل کا شعر کہنا ''چاول پر قل ہواللہ لکھنا'' قرار دیا تھا اور جب حالی نے یہ بات کہی تھی کہ ''جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے'' تو ان کے پیش نظر بھی غزلیہ شاعری کا پست معیار ہی تھا۔ اگرچہ کلیم الدین احمد نے مغربی عینک سے غزلیہ شاعری کو دیکھنے کی کوشش کی تھی اور اسے نیم وحشی صنف سخن قرار دیا تھا، لیکن موضوعاتی اعتبار سے غزل کی پستی کے تعلق سے جو بات انہوں نے کہی تھی اسے یکسر رد بھی نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل غزلیہ شاعری اردو شاعری کی شناخت ہے اور یہ نہ صرف ایک شعری صنف ہے بلکہ ہماری لسانی تہذیب کی امین بھی ہے۔ واضح ہو کہ ہر زبان کی کوئی ایک ایسی صنف ہوتی ہے جو اس زبان کی شاعری کو اعتبار بخشتی ہے، اردو میں صرف غزل کو یہ درجہ حاصل ہے، اس لئے غزل کہنے والے شاعروں کو ہمیشہ اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ غزلیہ شاعری کا تقاضا کیا ہے۔ علامہ اقبال نے اگرچہ یہ شعر فنون لطیفہ کے تعلق سے کہا تھا، لیکن یہاں میں غزلیہ شاعری کے لئے کہنا مناسب سمجھتا ہوں ؎

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

جہاں تک بہار میں جدید اردو غزل کے ارتقا کا سوال ہے تو اس کی ڈور تو شاد عظیم آبادی سے جا ملتی ہے، لیکن مجھے اپنی گفتگو کو آزادی کے بعد کی جدید غزلیہ شاعری تک محدود رکھنا ہے اس لئے یہاں جمیل مظہری، اجتبیٰ رضوی، اختر قادری، پرویز شاہدی، مظہر امام، وہاب دانش، حسن نعیم، وفا ملک پوری، فرحت قادری، کلیم عاجز، پرکاش فکری، لطف الرحمن، علیم اللہ حالی، سلطان اختر، شاہد کلیم، صدیق مجیبی، عین تابش، مناظر عاشق ہرگانوی، شاداب رضی، شمیم فاروقی، شمیم قاسمی، ناشاد اورنگ آبادی، ظہیر صدیقی، منصور عمر، قاصر مکرم پوری، رفیق انجم وغیرہم کا ذکر آئے گا کہ انہیں شعرا کی بدولت بہار کی جدید اردو غزل نے اپنی شناخت مستحکم کی ہے۔ اگر بعد کے دنوں پر بھی تبصرہ مقصود ہو تو خورشید اکبر، عالم خورشید، نعمان شوق، قاسم خورشید، راشد طراز، کوثر مظہری، شاہد اختر، طارق متین، خالد عبادی، عطا عابدی، مبین صدیقی، ظفر امام وغیرہم کی غزلیہ شاعری بھی جدید غزلوں کے سرمایے میں گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مرحوم شاہد کلیم نے جدید غزل کے متعلق بہت اچھی بات کہی تھی کہ:

''جدید غزل گو شعرا کے یہاں نہ صرف باطن کی دنیا سے ہی موضوع کے اخذ و اکتساب کا سلسلہ دکھائی دیتا ہے بلکہ خارج کی دنیا سے بھی مواد حاصل کر لینے کا رجحان عام نظر آتا ہے۔''

بلاشبہ جدید شعرا کا یہی وصف انہیں قدیم شعرا سے منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ بہار کے جدید غزل کے شعرا نے جس طرح نئے استعارات، نئی تشبیہات، نئی علامتوں کے ذریعہ اپنے تخیلات کی زمین کو زرخیز کیا اور اپنے شجر فکر و نظر کو ثمر آور بنایا اس کی مثال اوروں کے یہاں کم ہی نظر آتی ہے۔ چوں کہ میرے لئے اس مختصر مقالے میں ''سرسری اس جہان سے گزرے'' والی نوبت ہے، اس لئے یہاں فرداً فرداً تمام شعرا کی ذہنی روش اور ان کے شعری اظہار پر تفصیلی گفتگو ممکن نہیں کہ طوالت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ اس لئے یہاں چند شعرا کے اشعار پر اکتفا کیجئے اور خود ہی یہ فیصلہ کیجئے کہ بہار کے جدید غزل گو شعرا نے دنیائے غزل کی کس طرح عاقبت سنواری ہے۔

جدید غزل کے باب میں شاد عظیم آبادی کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے کہ انہوں نے اپنی غزل کو نہ صرف وسعت تخیل بخشا بلکہ اسلوب میں بھی جدت پیدا کی اور جس کی وجہ سے ان کی غزلیہ شاعری کی دنیا ان کے ہم عصروں سے قدرے مختلف نظر آتی ہے۔ حسن و عشق کا موضوع جو اردو غزل کا اوڑھنا بچھونا تھا اس سے شاد نے بھی دامن نہیں

PDF Compressor Free Version

بچایا ہے، لیکن اس روایتی اور پیش پا افتادہ مضامین میں بھی اپنی سادگی اور متانت کے نقوش چھوڑے ہیں۔ شعر ملاحظہ کیجئے ۔

ریا بھرے ہوئے دل کا نشاں ہے ماتھے پر
کہاں کا داغ کہاں دفعتاً ابھر آیا

ان کی نگاہِ ناز جو پلٹی تو دیکھنا
منھ دیکھتی رہے گی حقیقت مجاز کا

یہ بزمِ مئے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

بہار کے تعلق سے جدید غزلیہ شاعری کی گفتگو اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی جب تک کہ علامہ جمیل مظہریؔ کا ذکر نہ آئے۔ جمیلؔ مظہری نے کلاسیکیت کے دامن کو بھی عزیز سمجھا اور نئے رجحانات کے دنیا کی بھی سیر کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افکار و نظریات کی دنیا شعور نو سے منور ہے ۔

بہ قدر پیمانۂ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

ہے روح تاریکیوں میں حیراں، بجھا ہوا ہے چراغِ منزل
کہیں سرِ راہ یہ مسافر پٹک نہ دے بوجھ زندگی کا

جلانے والے جلاتے ہی ہیں چراغ آخر
یہ کیا کہا کہ ہوا تیز ہے زمانے کی

حریم ناز کا پایہ کچھ اور اونچا کر
کہ اب نگاہ زمانے کی دور جانے لگی

خم الٹتے ہیں تو مل جاتی ہے پیاسوں کو شراب
میری مستی بھی تو میخانے میں برباد نہیں

جدید غزلیہ شاعری کی تاریخ میں پرویزؔ شاہدی اور مظہر امامؔ کی حیثیت بھی مقدم ہے۔ اگرچہ مظہر امامؔ نے جہانِ غزل میں ایک نئی صنف ''آزاد غزل'' کی ایجاد بھی کی، مگر انہوں نے روایتی غزل میں جو نئے خیالات کی دنیا آباد کی، ساتھ ہی ساتھ الفاظ کی نشست و برخاست کے جو اصول مرتب کیے وہ ان کی شناخت کا ضامن ہوا۔ ان کے مجموعہ کلام ''زخم تمنا''، ''رشتہ گونگے سفر کا''، ''پچھلے موسم کا پھول'' اور غزلیہ شاعری کی کلیات ''پالکی کہکشاں کی'' کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ وہ ایک منظم ذہن کے فنکار تھے۔ شروع میں کلاسیکیت کے دلدادہ رہے، پھر ترقی پسندیت کو ایمان جانا اور جب جدیدیت کی چنگاری ہوا کی تلاش میں تھی تو اس کو شعلہ بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جدید غزل کو معیار و وقار عطا کرنے والوں میں انہیں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اشعار ملاحظہ کیجئے ۔

یہ معرکہ بھی عجب ہے بڑا دلیر ہے وہ
کہ فتح یاب نہیں اور ہارتا بھی نہیں

نہ جانے کس راہ چلوں، کون سے رخ مڑ جاؤں
مجھ سے مت مل کہ زمانے کی ہواہوں میں بھی

یہ راہِ خار و سنگ میرا انتخاب تھی
جو مرحلے بھی آئے وہ حسب قیاس تھے

(مظہر امام)

ترقی پسند شعرا میں پرویزؔ شاہدی کا شمار ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی فکری توانائی سے اس تحریک کو استحکام بخشا تھا، لیکن جدید غزل کی فضا قائم کرنے والوں کی فہرست میں بھی وہ اولیت کے حقدار ہیں، کیوں کہ موضوعاتی اعتبار سے غزل جو حسن و عشق کی دنیا تک محدود تھی اس میں انہوں نے زندگی کی تلخ سچائیوں کے رنگ بھرے ہیں۔ بالخصوص سماجی اور سیاسی موضوعات کو شعری قالب میں ڈھالنے کا ہنر انہیں خوب خوب آتا ہے اور یہی وصف ان کی جدید غزل کو اوروں سے منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ ان کے یہاں فکری توانائی، جذبے کی آنچ اور تجربات و مشاہدات کی قوتِ لاثانی کی بے مثال دنیا دکھائی پڑتی ہے۔ اشعار ملاحظہ کیجئے ۔

سنا ہے ان کے لب پہ کل تھا ذکر مختصر میرا
تصور دے رہا ہے طول اس کو کس قدر میرا

راہ گزر ہی راہ گزر ہے راہ گزر سے آگے بھی
ہم نے جا کر دیکھ لیا ہے حدِ نظر سے آگے بھی

PDF Compressor Free Version

اپنے نقوشِ پا سے زمانے کے واسطے
ترتیب دے رہا ہوں نصابِ سفر کو میں

(پرویز شاہدی)

اسی عہد میں بہار کی جدید غزلیہ شاعری کے منظرنامے پر وفا ملک پوری، فرحت قادری ابھرتے ہیں اور اپنی فکر تازہ سے اپنے ہم عصروں کو چونکانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان کا اثاثہ غزل قلیل ہے، مگر جدید غزلیہ شاعری کے باب میں انہیں کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

کیوں تیرگیٔ وقت خفا ہم سے ہوئی ہے
اک شمع جلانے کی خطا ہم سے ہوئی ہے

(وفا ملک پوری)

تمہارے شہر میں کون اس کو جان پائے گا
جو اپنے گاؤں میں رہتا ہو اجنبی کی طرح

(فرحت قادری)

جیسا کہ پہلے بھی ذکر آچکا ہے کہ تمام شعرا پر تفصیلی گفتگو اس مختصر مقالے میں ممکن نہیں لیکن جدید غزل کی تاریخ اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی جب تک کلیم عاجز، پرکاش فکری، لطف الرحمٰن، علیم اللہ حالی، حسن نعیم، سلطان اختر اور صدیق مجیبی کا ذکر نہ آئے۔ یہاں میں ان شعرا کے نمونہ کلام پر ہی اکتفا کرتا ہوں، البتہ کلیم عاجز، حسن نعیم اور سلطان اختر پر قدرے تفصیلی گفتگو کروں گا کہ ان شعرا نے اپنی فکر تازہ کے ذریعہ جدید غزل کی تقدیر بدلی ہے۔

جلے مکانوں میں بھوت بیٹھے بڑی متانت سے سوچتے ہیں
کہ جنگلوں سے نکل کے آنے کی کیا ضرورت تھی آدمی کو

زمیں پہ آگ اگلنے لگے تو کیسا ہو
ہر ایک شہر جو جلنے لگے تو کیسا ہو

(پرکاش فکری)

مت پوچھ کہ اندر سے میں کیوں ٹوٹ رہا ہوں
آئینہ کبھی اپنی صفائی نہیں دیتا

(صدیق مجیبی)

گزرا ہر ایک شخص مجھے دیکھتا ہوا
گویا میں آدمی نہ ہوا آئینہ ہوا

ہر طرف پت جھڑ کی آوازوں کی چادر تن گئی
دشت میں میری صدا کا جسم بھی عریاں نہ تھا

(علیم اللہ حالی)

یہ دھواں سا اپنے چاروں اور ہے کیوں رات دن
جسم کے اندر کہیں ہم درد سے جلتے تو نہیں

(وہاب دانش)

ہر حادثہ شدید تھا لیکن بہ فیضِ فن
غم اپنا استعاروں، نظیروں میں بٹ گیا

(ظہیر صدیقی)

کہتا غلط تو خود مرے اعصاب ٹوٹتے
سچ بولتا تو شہر کے آداب ٹوٹتے

(ناصر مکرمپوری)

ماچس کی اک تیلی جیسی آنکھوں سے
حد نظر کا منظر جل بھی سکتا ہے

جکڑ کے رکھتا ہوں ساری اڑان مٹھی میں
ندی، پہاڑ، سمندر یہ دشت و دریا کیا

(شمیم قاسمی)

ہر لمحہ ٹوٹتا ہوا اک اضطراب تھا
اپنا وجود اپنے لئے اک عذاب تھا

(عین تابش)

روز و شب بے کیف تھے شام تھی سوئی ہوئی
شہر کی آنکھوں میں تھی بے منظری بوئی ہوئی

(شاہد کلیم)

حرف کو ہم نے حکایت کا ہنر بخشا ہے
ہم پیمبر تو نہ تھے پھر بھی مثالوں میں رہے

جلتے رہے زخموں کے دیئے طاقِ ہنر میں
پھر بھی رخِ گیتی پہ سویرا نہیں دیکھا

PDF Compressor Free Version

تعبیر کے سراب ہیں آنکھوں میں موجزن
بازارِ دشت شب کا خریدار نہیں تھا

(لطف الرحمٰن)

بہار میں جدید غزل کے باب میں کلیم عاجزؔ کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ اگرچہ وہ کلاسیکیت کے دلدادہ رہے ہیں اور مسلک میرؔ کے معتقد بھی، لیکن ان کے یہاں کلاسیکیت اور جدیدیت کا بہترین سنگم دکھائی دیتا ہے۔ انہوں نے ایک طرف غزل کو حسن تغزل بخشا ہے تو دوسری طرف اسے احساس وشعور کی نئی دنیا بھی عطا کی ہے۔ وہ اپنے ہم عصروں میں دونوں اعتبار سے مقبول رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ناقدین نے کلاسیکی شاعری کی تنقید میں بھی انہیں جگہ دی اور جدید شاعری کے باب میں بھی انہیں نمایاں مقام عطا کیا۔ اس بات کا احساس خود کلیم عاجزؔ کو بھی تھا کہ ؎

رسن و دار نہیں اہل جنوں کی منزل
ہم مسافر ہیں بہت دور کو جانے والے

اور اب چند اشعار ملاحظہ کیجئے جس میں شاعر کا تخلیقی عرفان اور شعور و وجدان بامِ عروج کو پہنچا ہوا ہے ؎

کیا خبر بے خودیٔ شوق کہاں لے جاتی
خیریت ہے کہ ترا نقش قدم یاد رہا

کتنی مدت ہوئی آنسو نہیں تھمے اپنے
اب یہ برسات نہ جائے گی قرینہ ہے یہی

کروٹیں لیتی ہیں سینے میں کچھ ایسی باتیں
جن کو سننے کو زمانہ ابھی تیار نہیں

پھول اشکوں کے جو ملتے ہیں مرے دامن میں
ایسے گل صحن چمن میں کہاں ملتے ہیں

خشک ہو جاتے ہیں آنسو تو آتا ہے لہو
غم وہ دولت ہے کبھی جس پر زوال آتا نہیں

بہار کے جدید غزل گو شعرا میں حسن نعیمؔ اور سلطان اخترؔ کو قدرے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ ان دونوں شعرا نے نئی غزل کی روح میں اتر کر اپنی دنیا آباد کی۔ حسن نعیمؔ کا پہلا مجموعہ ''اشعار'' کے نام سے جب ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا تو دنیائے ادب میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ واضح ہو کہ اس وقت ناصر کاظمی، ظفر اقبالؔ، اطہر نفیسؔ، ساقی فاروقی اور شکیب جلالی جیسے جدید غزل کے شعرا کی دھوم تھی، لیکن حسن نعیمؔ کے منفرد لب و لہجے کا جادو سر چڑھ کر بولا۔ اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

بامِ خورشید سے اترے کہ نہ اترے کوئی صبح
خیمہ شب میں بہت دیر سے کہرام تو ہے

بیانِ شوق بنا، حرفِ اضطراب بنا
وہ اک سوال کہ جس کا نہ کچھ جواب بنا

چہرے پہ مہر غم ہے خد و خال کی طرح
ماضی بھی دم کے ساتھ ہے اب حال کی طرح

تہذیب قتل گاہ نے اتنا سکھا دیا
مرنا کہاں کمال ہے، جینا ہے فن کہاں

سب کچھ اٹھا کے لے گئی دنیا خبر تو لے
سویا ہے ایک عمر تو اک لمحہ جاگ بھی

ان کے بعد کے مجموعہ غزل ''غزل نامہ'' اور ''دبستان'' کی غزلوں میں بھی ان کی نئی آواز سنائی پڑتی ہے۔ مثلاً ؎

خلوتِ امید میں روشن ہے اب تک وہ چراغ
جس سے اٹھتا ہے قریب شام یادوں کا دھواں

مختصر یہ کہ حسن نعیمؔ نے جدید غزل کی روایت کو نہ صرف وسعت دی بلکہ انہوں نے غزل کی جو تہذیب تھی اس میں اپنی شناخت مستحکم کی۔ موضوع اور مواد دونوں اعتبار سے اپنی غزلیہ شاعری کو زرخیز بنایا اور قارئین ادب کے لئے آسودگی کا سامان فراہم کیا۔

سلطان اخترؔ نے نئی غزل کو نئے اسلوب اور نئے موضوع سے ہم کنار کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ ان کی جدید غزلیں نہ صرف زندگی کی تلخ سچائیوں کی عکاس ہیں بلکہ اس میں تجربات ومشاہدات کی ایک نئی

PDF Compressor Free Version

دنیا آباد ہے۔انہوں نے معنوی تہہ داری اور فکری ندرت کو کمال بخشا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلیہ شاعری نیرنگیٔ زیست کی آئینہ دار بن گئی ہے۔اشعار ملاحظہ کیجئے ۔

تمام عمر یوں ہی ٹوٹنا بکھرنا ہے
یہ طے ہوا کہ ہمیں قسط وار مرنا ہے

تشنگی ڈھونڈ رہی ہے ہمیں صحرا صحرا
اور ہم ہیں کہ لب آب رواں بیٹھے ہیں

پھٹی پرانی سہی چھاؤں اوڑھ لو ورنہ
برہنہ دھوپ ابھی اور بے حیا ہوگی

تلاش کرتے نہیں سایۂ شجر درویش
گزار لیتے ہیں صحرا میں دوپہر درویش

کاسۂ دل سے لہو، آنکھوں سے پانی لے گیا
اپنا قصہ کہہ کے وہ میری کہانی لے گیا

مذکورہ اشعار کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ سلطان اختر نے غزلیہ شاعری کی عاقبت سنوارنے میں کس قدر اپنا خونِ جگر صرف کیا ہے۔ ان کا تخلیقی ذہن غزل کے دو مصرعے کو معنی کا وہ سمندر عطا کرتا ہے کہ جس میں غوطہ زن ہوئے بغیر ہم کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتے کہ ان کے یہاں وجدان وشعور کے لعل وگہر تو اس سمندر کی تہوں میں بکھرے پڑے ہیں۔اگر چہ تاج پیامی، مناظر عاشق ہرگانوی، شکیب ایاز، ارمان نجمی، رفیع الدین راز، منصور عمر، منیر سیفی، شاداب رضی، ناشاد اورنگ آبادی وغیرہم کا شعری سفر جدید رجحانات کی آمد سے پہلے شروع ہو چکا تھا اور کلاسیکیت کو فروغ دینے والوں میں ان شعرا کا شمار ہوتا ہے، لیکن صحرائے جدید غزل میں بھی ان کی آوازیں دور سے ہی پہچانی جاسکتی ہیں ۔

شاخِ غم پر ابھی سی ہر تمنا معلوم
ٹوٹے لمحوں کے شہر کا تماشا معلوم

مکاں جلانے کی خواہش میں اب وہ جلتا ہے
چراغ روشنی کا گرچہ ایک ذریعہ ہے

ہاتھ ملایا سورج سے ، دشت سے آنکھ
دل کے اندر سناٹا سا پھیل گیا

(مناظر عاشق ہرگانوی)

یہ کس نے دشت کی تصویر آنکھ میں رکھ دی
سکوت ایسا برہنہ کبھی نہیں دیکھا

(شکیب ایاز)

اب آدمی سے کہو جنگلوں میں بس جائیں
تمام شہر میں ہے برتری مشینوں کو

(منیر سیفی)

روشنی میں تو سبھی لے گئے سبقت لیکن
اندھے غاروں میں فقط میں ہی اکیلا اترا

(منصور عمر)

بات چلی ہے جب ناموروں کی
کچھ بے نام ونسب یاد آئے

(شاداب رضی)

ابھی تو اور بھی لو دے گی خواب کی تعبیر
دلِ شکستہ سے کہنا کہ حوصلہ رکھے

وہ مرے حرفِ انتساب میں ہے
جو بھی اس عہد کے نصاب میں ہے

ایک کسک چٹکیاں لیتی ہے ازل سے دل میں
اک خلش ہے کہ نہ بڑھتی ہے نہ کم ہوتی ہے

(رفیع الدین راز)

بجھتی جائے گی گزرتی ساعتوں کی روشنی
ٹوٹتے نشہ کا خوں میں ذائقہ رہ جائے گا

(ارمان نجمی)

جلتا درخت دیکھ کے سب اُڑ گئے مگر
اب بھی ہیں کچھ پرندے بسیرا لئے ہوئے

(تاج جامی)

PDF Compressor Free Version

چاہتا ہوں کہ چاند کو چھولوں
اپنی اوقات بھول جاتا ہوں

(ناشاد اورنگ آبادی)

بوڑھے بچے اور جواں سب آگ میں جل جائیں گے
ایک سولہ سال کی لڑکی بچا لی جائے گی

(شمیم فاروقی)

بہار کے شعرا کی غزلیہ شاعری کے ادواری مطالعے میں ۸۰ء کے بعد کے شعرا کو بڑی اہمیت حاصل ہے کہ ان شعرا نے جدیدیت کی زمین اور مابعد جدیدیت کی آب وہوا میں اپنے فکر نو کی دنیا آباد کی ہے۔ بالخصوص خورشید اکبر، عالم خورشید، نعمان شوق، جمال اویسی، راشد طراز، کوثر مظہری، طارق متین، خالد عابدی، شاہد اختر وغیرہم نے دنیائے جدید غزل کے آسماں کو رونق بخشی ہے۔ یہاں ان تمام شعرا پر بھی تفصیلی گفتگو ممکن نہیں۔ خورشید اکبر کے شعری مجموعے ''سمندر خلاف رہتا ہے'' اور ''بدن کشتی بھنور خواہش'' بہ لحاظ موضوع ومواد جدید غزل کے باب میں گراں قدر اہمیت کے حامل ہیں کہ ان کی غزلیہ شاعری نے جدید غزل کی روایت کو استحکام بخشا ہے ۔

شہ رگوں میں موجزن تیری انا
تیرا نقشہ کج کلاہوں میں خدا

پانی پہ لکھ رہا ہے وہ تفسیر زندگی
اب کے یہ میرا شہر بھی صحرا نگل نہ جائے

اگر چہ نعمان شوق نے اپنی نظمیہ شاعری سے اپنی شناخت مستحکم کی ہے، لیکن افق جدید غزل پر بھی ان کی حیثیت ایک نمودار ستارے کی ہے۔ ان کے کئی شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ اشعار ملاحظہ کیجئے ۔

جس کا ہر رنگ تھا تفہیم نظر میں مصروف
جن کے ابلاغ میں بس حق اسی تصویر کا ہے

برسات تک میں لوٹ سکوں گا ، یقیں نہیں
رونے بھی دو لپٹ کے پرانے مکان سے

کوئی تو آواز ابھرے دل کے ویرانے سے اب
چاٹتا جاتا ہے مجھ کو میرے اندر کا سکوت

جمال اویسی ۱۹۸۰ء کے قبل شعری منظر نامے پر ابھرے نگران کی شناخت بعد کے دنوں میں ہی ہوئی ہے۔ ان کے یہاں بھی رچا ہوا غزلیہ مزاج دیکھنے کو ملتا ہے اور فکری اعتبار سے تازہ کاری بھی۔

جمال اویسی کا پہلا مجموعہ ''رکا ہوا سیل'' ہے۔ اس کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پیش پا افتادہ احساسات کو ایک انوکھے انداز میں پیش کرتے ہیں اور نئے احساسات کو معنی کا نیا لباس پہنانے میں کامیاب ہیں۔ اشعار ملاحظہ فرمائیے ۔

دنیا کا سمجھنا ترے بس میں نہیں اے دل
یہ ہاتھ میں لے گی کبھی قدموں میں رکھے گی

ٹوٹ کر بکھری زمیں پر کوئی شئے
منتشر کمرے کا سناٹا ہوا

خورشید اکبر اور جمال اویسی کے ساتھ ساتھ عالم خورشید نے بھی اپنی فکر نو سے جدید غزل کو تازگی بخشی ہے۔ ان کے بھی کئی شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ اشعار ملاحظہ فرمائیے ۔

ہر بار وہی پچھلی روایت نہیں ہوگی
اب ہم سے کسی حال میں ہجرت نہیں ہوگی

مری تشنہ لبی کا کب یقیں آئے گا دریا کو
میں صحرا کو بھی لے آؤں اگر اپنی گواہی میں

نئی نسل کے شعرا میں طارق متین نے بھی عصری شعری منظر نامے پر اپنی شناخت مستحکم کی ہے کہ ان کے یہاں مشاہدات وتجربات ایک نئے اسلوب کی صورت میں سامنے آئے ہیں۔ شعر ملاحظہ کیجئے ۔

یاروں نے خوب جا کے زمانے سے صلح کی
میں ایسا بد دماغ یہاں بھی بچھڑ گیا

سب کی قسمت میں نہیں ہوتیں فلک پیمائیاں
پھر بھی اڑنے کے لئے شہپر بنانا چاہئے

PDF Compressor Free Version

تصنع کی عمل داری بہت ہے
جدھر دیکھوں ادا کاری بہت ہے

اسی صف میں شاہد جمیلؔ، عطاؔ عابدی اور مبینؔ صدیقی نمایاں نظر آتے ہیں۔ عطاؔ عابدی کے کئی شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ انہوں نے بھی اپنی فکر نو سے غزل کے خاکوں کو رعنائیاں بخشی ہیں۔ اشعار ملاحظہ کیجئے ۔

روایت کا ہے اب بھی سحر قائم
ہر اک جدت پرانی ہوگئی ہے

جاگتے ہی نظر اخبار میں کھو جاتی ہے
زندگی درد کے انبار میں کھو جاتی ہے

تجھے بھلانے کے سب راستے سجا دوں گا
انا کی شاخ پہ پھر پھول آنے والے ہیں

(شاہد جمیلؔ)

حیرتی بن کے ہنس اٹھیں گے ہزاروں چہرے
کسی شیشے پہ ذرا مار کے پتھر دیکھو

(رفیق انجمؔ)

ہم اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ تمام علوم وفنون کا سرچشمہ انسانی فکر ہے، اس لئے کسی بھی انسان کی بصیرت وبصارت کی افادیت و اہمیت کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس کی فکری روش کیسی ہے۔ اگر کسی انسان کی فکر تعمیری اور صالح ہے تو اس کا نتیجہ فکر بھی کائنات کے لئے منفعت بخش ہوگا اور اگر اس کی فکر میں کسی طرح کی کجی واقع ہوگی تو اس کا اثاثہ فکر رطب ویابس کی صورت اختیار کرلیتا ہے اور وہ خاکہ جہاں میں کوئی رنگ نہیں بھر پاتا، جب کہ فنون لطیفہ تو بے رنگی دنیا کے خاکوں میں رنگ بھرنے کے قرینۂ فطری کا نام ہے۔ جہاں تک ادب کا سوال ہے تو اس ازلی اور ابدی حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ادب آغاز سے ہی انسان کے لئے شعور وجدان، مسرت وبصیرت اور قدرے روحانی تسکین کا ذریعہ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر عہد میں تخلیق کار اور فنکار ہمارے لئے چراغِ راہ رہے ہیں۔ آج بھی ہمارے روشن مستقبل کا انحصار ہمارے ادبا، شعرا اور دانشوروں کے افکار ونظریات پر ہے کہ ان کی تعمیری فکر ونظر کی بدولت ہی دنیا کی رنگینی اور رعنائی برقرار رہ سکتی ہے۔ مذکورہ شعرا کے کلام کا احتسابی جائزہ لینے کے بعد یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ بہار کے شعرا نے اپنے ذہن کی زرخیز زمین پر فلاح وبہبودِ انسانیت کے شجر کو ثمر آور بنایا ہے۔ نتیجتاً بہار کی جدید اردو غزل موضوع ومواد اور اسلوب بیان ہر اعتبار سے تاریخ ادب میں ایک روشن باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر ہم کسی بھی بنیاد پر بہار کے جدید غزل گو شعرا کو نظر انداز کرتے ہیں تو ہماری ادبی تاریخ کبھی مکمل نہیں ہوسکتی۔

بولی اور زبان

بولی کیا ہے؟ زبان کی سہیلی اور سخن کی مشق۔ بچے کی آنکھوں اور ماں کی لوریوں سے اس کی ابتدا ہوتی ہے۔ پیار ومحبت کے بول جو بات چیت کی صورت بن جائیں، طبیعتوں کے رجحان اور ماحول کی رعایتوں سے بطور استفسار وبہ شکل جواب کوئی لفظ بھی آمد سخن میں منہ سے نکل پڑے جو اپنے مطلب ومفہوم کو پورا کرے، بار بار دہرایا جائے اور کثرت استعمال سے بڑھتا اور پھیلتا رہے، حتیٰ کہ اسما وافعال، مبتدا وخبر بن جائے، پوری طرح مقبول ورائج ہو تو انہیں لفظوں کے کثرت استعمال کا نام بولی ہے۔ ان کے تلفظ کے لہجوں اور ترنم کے سروں میں باہمی یکسانیت ویگانگت اتنی واضح اور نمایاں ہوتی ہے کہ اپنے حلقہ اثر کی شناخت بن جاتی ہے۔ بولی گھروں سے نکل کر گاؤں اور قریوں میں پھیلتی ہے۔ خطوں اور علاقوں کی نمائندہ ہوکر اپنے قبضہ ودخل کا دعویٰ کرتی ہے، مگر بولی کتنی ہی ٹھوس اور ٹکسالی کیوں نہ ہو، وہ زبان کی جملہ صلاحیتوں کی حامل نہیں۔ خواہ گفت وشنید کے لئے کسی قدر کارآمد ومفید ہو، مگر صرف اسی کے اجزائے ترکیب واستعمال سے قومی وملکی عزائم وحوصلے پورے نہیں ہوتے۔ بولی دلچسپ ودل پسند اور خواب آور ہی کیوں نہ ہو، لیکن معرکوں کی رجز خواں اور دفتروں کی زبان نہیں بن سکتی۔ وہ علمی مباحثوں کی معاون ودستگیر ہے نہ تحقیقاتی تلاش وجستجو کی آئینہ دار، البتہ جب وہ بولنے کے مرتبے اور مقام سے آگے بڑھے اور نئی بلندیوں اور گہرائیوں کا سامنا کرے تو پھر وہ بولی نہیں رہتی بلکہ زبان بن جاتی ہے۔ (ماخوذ از ''مقالات سلطان احمد'' ص ۵۱ تا ص ۵۳)

PDF Compressor Free Version

پروفیسر ظفر حبیب

Ex. Deptt. of Urdu (P.G.) L.N.Mithila University, Darbhanga

معین الدین دردؔ کی شعری خدمات

لکھنیاں اور بیگوسرائے کی سطح پر جناب معین الدین دردؔ کا شمار اردو شاعری کے باوقار خادمین میں ہوتا ہے۔ آپ کی پیدائش لکھنیاں میں ۱۹۱۷ء میں ہوئی۔ لکھنیاں کے میاں جی جان محمد جن کی پیدائش ۱۸۱۱ء میں ہوئی تھی وہ خود بھی شعر موزوں کیا کرتے تھے اور خانوادۂ نوابان سمری بختیار پور ضلع سہرسہ کے یہاں اتالیقی کے منصب پر فائز تھے۔ میاں جی مرحوم کو پروردگار نے دو لائق وفائق اولادوں سے نوازا تھا۔ ایک مولوی عبدالوحید تھے اور دوسرے حکیم عبدالمجید۔ عبدالمجید مرحوم کے دو بیٹے حکیم محمد ادریس اور حکیم محمد اسحٰق پیشہ طبابت سے وابستہ رہے۔ حکیم محمد اسحٰق کے بڑے صاحبزادے حکیم محمد فضل الرحمٰن مرحوم نے آبائی پیشہ کو اپنی خدمت سے وقار بخشا۔ فی الوقت ان کے چھوٹے صاحبزادے حکیم مستفیض الرحمٰن سرورؔ نے بزرگوں کی جانشینی قبول کرلی اور سرکاری ملازمت سے وابستہ ہیں۔

مولوی عبدالوحید مرحوم کثیر العیال تھے۔ کئی اولاد نرینہ میں سے ایک کا نام جو سب سے بڑے تھے محمد سعید مضطرؔ تھا، جو پہلے بی۔ پی ہائی اسکول بیگوسرائے میں معلم بحال ہوئے بعدۂ انہوں نے وکالت کو بطور پیشہ اختیار کرلیا۔ ان کے تین بیٹے مظہر حمید غمؔ، قمر حمید قمرؔ اور نصر حمید خلشؔ نے شاعری کو گلے لگایا۔ جناب معین الدین دردؔ ان کے سب سے چھوٹے صاحب زادے تھے۔ مولوی عبدالوحید کا انتقال ۱۹۳۶ء میں ہوا۔ آپ گھر بیٹھ کر کچے چمڑے کی تجارت کیا کرتے تھے۔ بعد کے دنوں میں اس پیشہ کو ان کے پوتوں نے اختیار کیا۔ آج کے دنوں میں ان کا پروتا جدید لب ولہجہ کا اردو کا مشہور شاعر اور کئی رسائل کا مدیر بن کر اسلاف کا نام روشن کرنے میں معروف ہے۔ اس صاحب طرز شاعر کو دنیا طارقؔ متین کے نام سے جانتی ہے۔

معین الدین دردؔ کی ابتدائی تعلیم گھر ہی میں مکمل ہوئی۔ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۴ء تک انہوں نے اسکول کی عمومی تعلیم حاصل کی۔ عربی اور فارسی زبانوں میں ان کی دلچسپی کے پیش نظر ان کو لکھنیاں کے متبحر عالم دین حضرت مولانا محمد یحییٰ قاسمیؒ کے زیر سایہ ڈال دیا گیا۔ ۱۹۳۶ء میں والد کے انتقال کے بعد انہیں اسلامیات کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے مدرسہ اسلامیہ بہار شریف بھیج دیا گیا۔ ۱۹۳۷ء میں آپ وہاں سے نکل کر لکھنؤ چلے گئے اور وہاں کے مشہور، باوقار مدرسہ فرقانیہ میں داخلہ حاصل کرلیا۔ اس مدرسہ میں زبان فارسی کے مشہور عالم اور شاعر مولانا قدرت اللہ بیگؔ کے سامنے انہیں زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا موقع نصیب ہوا۔ موصوف اپنی غیر منقوط فارسی نعت کے لئے جس میں اشعار کی تعداد کئی ہزار کی تھی، مشہور اور معروف تھے۔

معین الدین دردؔ صاحب پر مولانا کی خصوصی نگاہ تھی۔ اس نگاہ سے فیضیابی اور سیرابی کا سلسلہ جاری تھا کہ نامساعد حالات نے انہیں جکڑ لیا۔ ۱۹۳۹ء میں جب وہ ''دبیر کامل'' کے آخری مرحلہ سے گزر رہے تھے تو انہیں اپنے وطن واپس آجانا پڑا یعنی تعلیم کا سلسلہ بھی رکا اور ''دبیر کامل'' کی سند بھی چھوٹی۔ مولانا یحییٰ صاحب سے چوں کہ آپ نے فارسی زبان وادب کی پختہ تعلیم حاصل کرلی تھی اور عربی صرف ونحو بھی مکمل کرلیا تھا اس لئے آپ کی لیاقت علمی کو بالیدگی حاصل ہوگئی تھی۔

زمانۂ طالب علمی میں استاد محترم حضرت قدرت اللہ بیگؔ کا فیض اس شکل میں رونما ہوا کہ انہوں نے اردو اور فارسی کی مخلوط زبان میں ایک غزل قلم بند کرکے ان کے حضور پیش کردی۔ استاد محترم یہ دیکھ کر خوش ہوئے اور مشق سخن جاری رکھنے کی صلاح دی۔ اسے شومی نصیب کہئے یا تقدیر کا لکھا کہ گھر آنے کے بعد انہیں قوت لایموت کی فکر لاحق

PDF Compressor Free Version

ہوئی اور ایک بہت ہی چھوٹا سا کاروبار انہوں نے بازار میں شروع کر دیا، پھر انہیں رشتہ ازدواج سے جوڑ دیا گیا۔ چند برس ہی گزرے تھے کہ اہلیہ نے داربقا کا رخ اختیار کر لیا۔ یہ سب کے سب حوادث تھے جو ان کے حصے میں آئے۔ دوسری شادی جب ہوئی تو مسلسل پانچ بیٹیاں یکے بعد دیگرے ذمہ داری کا احساس دلانے کو حاضر ہو گئیں، پھر ایک بیٹا جاوید اقبال وجود میں آیا، وہ بھی اپنی پشت پر دو بہنوں کو لے کر آیا۔ اس دختر کشی اور زن سوزی کے زمانہ میں جب کہ مسلم معاشرہ تلک اور جہیز کی لعنتوں سے دن بہ دن بوجھل ہوتا جا رہا ہو، ایک کمزور معاشی بساط کے شاعر پر کیا گزری ہوگی اسے صرف تصور کی آنکھوں سے ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ دردؔ صاحب اپنی کمزور معاشی بساط پر وقت کے مہرے چل رہے تھے، ہر دم اس خوف میں مبتلا ہو کر کہیں کوئی شہ نہ دے دے اور کہیں بازی زچ نہ ہو جائے۔

کوئی شخص شاعری اس وقت شروع کرتا ہے کہ جب اس کا خالق اعلیٰ اسے وجدان شعری سے نواز دیتا ہے۔ دردؔ صاحب کے اندر وجدانِ شعری موجود تھا۔ چنانچہ قیام لکھنؤ کے زمانہ ہی میں انہوں نے ایک غزل فارسی آمیز اردو میں رقم کر کے اپنے استاد ذوی وقار قدرت اللہ بیگؔ کے سامنے رکھ دی تھی۔ اس غزل گوئی سے قبل ہی وہ ذوقؔ اور داغؔ کا پورا کلام پڑھ چکے تھے۔ درسیات فارسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے خاقانیؔ کا مطالعہ بھی خصوصی طور پر کیا تھا۔ ان کی شاعری نے ان دونوں کے اثرات قبول کئے۔ بعد کے دنوں میں جب وہ مستقل طور پر لکھمنیاں میں قیام پذیر ہو گئے تو بیگو سرائے کے مشاق شاعر خلیلؔ بیگو سرائی کے سامنے انہوں نے اپنا سر نیاز جھکا لیا۔ خلیلؔ بیگو سرائی نوحؔ ناروی اور جلیلؔ مانک پوری کے شاگرد رہ چکے تھے، اس لئے ان کی شاعری فکری سے زیادہ نمائشی اور اسلوبیاتی تھی۔ دردؔ صاحب کی شاعری پر خلیلؔ صاحب کی صناعی اور آرائشی شاعری کا اثر کم پڑا، لیکن داغؔ اور ذوقؔ اور مذکورہ دو لکھنؤ اسکول کے شاعروں کے مطالعہ نے ان کی شاعری میں تغزل کا رنگ نمایاں کیا۔ ان کی پہلی غزل کا جو شعر دستیاب ہے، وہیں سے اس کی جھلک نظر آتی ہے ؎

از ذرہ نوازیٔ تو ذرات جہاں مہر است
کہ پرتو گیر ہے از ارض تا لوح وقلم میرا

یہ شعر عارفانہ بھی ہے، استاد محترم کی خدمت میں عقیدت کا نذرانہ بھی ہے اور محبوب کی عظمت کا بیانیہ بھی ہے۔ آگے کے دنوں میں عارفانہ اور عاشقانہ دونوں ہی رنگ شانہ بہ شانہ ان کی پوری شاعری میں موجود نظر آتا ہے۔ لکھنؤ چھوڑنے کے باوجود خلیلؔ بیگو سرائی کی رہنمائی نے دردؔ صاحب کو دونوں انداز کی شاعری میں پختگی عطا کر دی۔

معین الدین دردؔ سراپا شاعر تھے۔ ''اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہئے'' کی کیفیت میں ان کے شب و روز بسر ہوتے، لیکن یہ بیخودی غالبؔ والی بیخودی نہیں تھی۔ جناب دردؔ ایک ثقہ آدمی تھے۔ انہیں روسیاہی کی بجائے چہرہ پر نور کی آرزو تھی، اس لئے اس نوع کی آلائشوں سے وہ پاک اور مزکیٰ تھے۔ صبر و قناعت ان کا شیوہ تھا۔ راضی بہ رضا کے وہ قائل تھے البتہ ''دل سے ذوق رخ نیکو نہ گیا'' کے مصداق تھے، اس لئے ان کی شاعری میں رنگینی و سرشاری بھی ہے، بیخودی و ہشیاری بھی ہے۔

دردؔ کا مجموعہ کلام جو تقریباً سوا سو صفحات کو محیط ہے ان کی شاعری کے تمام رنگوں کا مظہر ہے۔ دردؔ صاحب کی شاعری کی عمر طویل ہے۔ ۱۹۳۷ء میں جب وہ اپنے وطن واپس آ کر مستقل طور پر اقامت گزیں ہو گئے تو اس وقت کے حالات کی تمام تر نامساعدت کے باوجود ان کا شوق شاعری پر جوش اور ولولہ انگیز تھا۔ اپنے ہم عمر احباب کو جمع کر کے انہوں نے ''گلزار ادب'' نام کی انجمن قائم کی اور اپنی نظامت میں برسوں اس انجمن کو زندہ اور فعال بنائے رکھا۔ اس انجمن کی باضابطہ ماہانہ نشستیں ہوا کرتی تھیں جن میں ان کے معاصر شعرا کے علاوہ وقتاً فوقتاً اس عہد کے معمر شعرا بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ ایسے شاعروں میں خلیلؔ بیگو سرائی، حافظؔ مشکی پوری اور مبارکؔ عظیم آبادی (مقیم بیگو سرائے) کا نام خصوصیت سے قابل ذکر تھا۔ (اس موضوع پر قمر حمید کی ایک مثنوی ''مشاعرہ انجمن گلزار ادب'' کے نام سے تحریر کردہ قلمی نسخہ کے بطور راقم الحروف کے پاس محفوظ ہے جس میں اس انجمن کی سرگرمی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔)

خلیلؔ بیگو سرائی دردؔ صاحب کو خواجہ کے لقب سے پکارتے تھے، چنانچہ جب ''عالمگیر'' لاہور میں پہلی بار ان کی دو غزلیں شائع ہوئیں تو ان میں ان کا نام جناب خواجہ معین الدین دردؔ لکھا گیا تھا۔ ''عالمگیر'' اپنے عہد کا ایک باوقار ادبی رسالہ تھا۔ اس کے مدیر نے شاعروں کی درجہ بندی کر رکھی تھی۔ مبتدی شاعروں کا وہ صرف نام اور تخلص درج کرتے تھے، اس سے

PDF Compressor Free Version

اوپر کا درجہ جناب کے ساتھ ہوتا تھا اور اس سے اوپر ''حضرت جناب'' لکھا جاتا تھا۔ دردؔ صاحب کی پہلی اشاعت غزل ہی میں ان کے نام کے ساتھ جناب اور خواجہ لگا دیا جانا اس کی دلالت کرتا ہے کہ ''عالمگیر'' کی نظر میں دردؔ صاحب عام شاعروں سے قدرے بلند تھے۔

۱۹۶۰ء میں معین الدین دردؔ شہر مدھے پورہ (کوسی ڈویژن) کے کل بہار مشاعرہ میں شریک ہو کر گھر واپس ہو رہے تھے تو ان کا قلمی دیوان ''سفینۂ دردؔ'' ان کے سامانوں کے ساتھ کوئی اچکا اچک لے گیا۔ دردؔ صاحب کی شاعری کے لئے یہ ایک عظیم حادثہ تھا۔ تقریباً پانچ سو غزلیں اس مسودہ میں ردیف وار درج تھیں۔ ان کا غیوب ان کے لئے نا قابل تلافی اور نا قابل برداشت تھا۔ اس کے بعد شاعری سے وہ توبہ کر بیٹھے۔ مقامی مجالس کی شرکت بھی ترک کر دی۔ ایک لمبا عرصہ اس پر گزر گیا۔ آخرش لکھمنیاں کے بالیدہ شعری ماحول، ہر ماہ کی منعقدہ نشستوں کی شہرت اور تمام شعرا کا اصرار انہیں دوبارہ اس میدان میں لے آیا۔ پہلے انہوں نے اپنی پرانی غزلوں کو حافظہ کی کوٹھری میں تلاش کیا جو دستیاب ہو سکا اسے کچھ حذف اور اضافہ کے ساتھ قلم بند کیا، مگر وہ بات کہاں ''مولوی مدن کی سی'' والی کیفیت برقرار رہی، پھر بھی بڑی بات یہ ہوئی کہ انہوں نے چل رے خامہ بسم اللہ کہہ کر اپنے قلم کو اذن حتمی دے دیا۔ یہاں سے ان کی شاعری کا دوسرا اور آخری دور شروع ہوا جو اب قارئین کے سامنے ہے۔

معین الدین دردؔ کی موجودہ شعری اثاث بیشتر غزلوں پر مشتمل ہے۔ ایک دو قطعہ بند تخلیقات ہیں جنہیں نظم کا بدل کہا جا سکتا ہے۔ علامہ اقبالؔ پر ایک نظم ہے اسی طرح ''نذر بیخود'' کے زیر عنوان بھی ایک غزل ہے جسے نظم میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ ''جمشید پور فساد کے نام'' بھی ایک غزل نما نظم ہے۔ اسی طرح عرض حال بہ ضمن القاب اور عرض حال بہ حضور سرور کائنات بھی ہے۔ ان کے علاوہ چند رباعیات بھی دستیاب ہیں جنہیں یہاں درج کیا جائے گا۔ ان کے اشعار سے روشناس کرنے سے پہلے ایک امر واقعہ کا اندراج بھی لازم ہے۔

معین الدین دردؔ سراپا درد تھے، لیکن اسی کے ساتھ وہ بیخود بھی تھے۔ ان کی بیخودی کے کئی پر لطف واقعات مقامی اہل علم حضرات کے ذہنوں میں محفوظ ہیں۔ مثلاً یہ کہ بلیا بازار جوان کی رہائش گاہ لکھمنیاں سے تقریباً ایک کیلو میٹر مغرب میں واقع ہے وہ اپنا سارا دن اپنی دکان پر وہاں گزارتے تھے۔ وہ زمانہ اس علاقہ کے لئے بجلی سے محرومی کا تھا یعنی ۱۹۵۰ء کے آس پاس کا زمانہ تھا۔ جب وہ رات کے اندھیرے میں دکان سے گھر کے لئے چلتے تو ایک ہاتھ میں جلی ہوئی لالٹین اور دوسرے ہاتھ میں جھولتا ہوا تھیلا ہوتا۔ ہمیشہ یا تو کوئی غزل گنگناتے چلتے یا پھر کسی مصرع پر مصرع لگانے میں محو ہوتے۔ جب گھر میں داخل ہوتے تو ان کی اہلیہ پوچھتیں کہ لالٹین ہاتھ میں رکھنے سے کیا فائدہ جب کہ اندھیرے میں چلے آ رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ لالٹین کی لو اتنی تیز تھی کہ پورا شیشہ سیاہ ہو گیا، پھر جب کبھی انہوں نے احتیاط کے بطور لو کم کر دی تو معلوم ہوا کہ لالٹین کب کی بجھ چکی تھی اور وہ گھر چلے آئے۔

اس سے بھی پر لطف واقعہ یہ ہے کہ ایک بار جب وہ بلیا سے چلے تو ان کے آگے ایک بیل گاڑی چل رہی تھی۔ بہت دیر چلنے کے بعد انہوں نے گاڑی بان سے پوچھا کہ ارے بھائی تم کہاں جا رہے ہو۔ اس نے بتایا کہ مجھ کو پچپید (لکھمنیاں سے پانچ کیلو میٹر پورب) جانا ہے۔ جب انہوں نے یہ دریافت کیا کہ اس وقت کہاں پر ہو تو اس نے کہا کہ سانحہ پہنچ چکا ہوں (جو لکھمنیاں سے تین کیلو میٹر پورب تھا) تب انہیں اپنی بیخودی کا احساس ہوا اور وہ دیر رات گھر واپس ہوئے۔ جب ان کے احباب نے ان سے پوچھا کہ یہ استغراق کیسا تھا، تو کہنے لگے کل کے مشاعرہ میں پڑھنے کے لئے غزل کہہ رہا تھا۔

اسی طرح کی محویت کے عالم میں دکان پر بیٹھے بیٹھے اشعار موزوں کرتے اور کسی کاغذ پر لکھ لیتے پھر کوئی گاہک آتا تو اسے اسی پرزہ میں پڑیا باندھ کر سامان دے دیتے۔ اگر وہ پڑیا کسی صاحب علم اور باذوق کے گھر پہنچتا تو صاحب خانہ وہ کاغذ انہیں بھجوا دیتے۔ دردؔ صاحب خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ پرزہ جیب میں ڈال لیتے اور پھر بھول جاتے۔

اس طرز عمل نے ان کی شاعری کو بڑا نقصان پہنچایا۔ بروٹی کالج کے ایک مشاعرہ میں وفا ملک پوری بطور مہمان خصوصی شریک تھے۔ دردؔ صاحب بھی لکھمنیاں کے شاعروں کے ساتھ شریک بزم تھے۔ راقم الحروف مشاعرہ کی نظامت کر رہا تھا۔ دردؔ صاحب کو جب آواز دی گئی تو وہ اپنی بیاض کے ساتھ مائک پر آئے۔ بیاض بغل میں رکھ دی اور جیب سے

PDF Compressor Free Version

ایک پرزہ نکال کر غزل سنانے لگے۔ کچھ مٹا ہوا کچھ کٹا ہوا مصرع اور وہ لگے اسی کی ہجا لگانے۔ محفل کا موڈ خراب ہونے لگا۔ آخرش ناظم مشاعرہ نے ان کی بیاض اٹھا کر ان کے ہاتھ میں دی، تب انہوں نے سلیقہ سے پڑھنا شروع کیا۔ جب وفاؔ صاحب مائک پر آئے تو کہنے لگے کہ برسوں قبل جس شاعر کو جس انداز میں میں نے غزل پڑھتے سنا تھا، اس بار بھی ان کا انداز ویسا ہی تھا۔ یہ تبصرہ اہل محفل کو برا لگا، لیکن سچ کا انکار کون کرے۔

مذکورہ واقعات اس لئے درج کئے گئے کہ ان کے خویش جناب عبدالصمد تپشؔ جب ان کا مجموعہ مرتب کر رہے تھے تو انہیں اسی نوع کی دشواریوں سے واسطہ پڑا۔ پرزوں اور الگ الگ صفحات پر درج مصرعوں اور شعروں کو مرتب کرنا ان کے لئے دیدہ ریزی اور دماغ سوزی کا کام بن گیا جس کی وجہ سے مجموعہ کی ترتیب میں لمبا وقت لگ گیا، لیکن انہوں نے یہ ذمہ داری بحسن وخوبی انجام دے کر اس شاعر گمنام کو روشناس خلق کرنے کا فریضہ انجام دیا۔ میری نظر میں دردؔ صاحب کا یہ حق ان پر تھا جسے انہوں نے قرض سمجھ کر ادا کر دیا ہے۔ اس کے لئے وہ ستائش اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اب قارئین باوقار دردؔ صاحب کے اشعار کی قرأت سے لطف اندوز ہونا چاہیں گے۔

جہانِ عشق میں اے دردؔ نام پیدا کر
فرازِ عرش سے اونچا مقام پیدا کر
جبین حسن پر لکھ کر نقوش بیتابی
تحیرات میں اک اژدہام پیدا کر

ہے بہت اونچا نشیمن عشق کا
طائر تخئیل کی پرواز سے

شرابِ کیف چھلکاتا حجاب اندر حجاب آیا
عجب انداز سے ظالم ترا حسن و شباب آیا
نہیں آسان ہے اظہار احساسِ مخالف کا
لگائی گدگدی تو رخ پہ کب رنگ عتاب آیا
بشکل اضطرابِ چشم لیلیٰ دام ہستی میں
وہ ہوں مرغِ تمنا جو بذاتِ خود عذاب آیا

ہزار دور سہی ہم سے منزلِ مقصود
ہے اطمینان ، قدم تو بڑھائے جاتے ہیں
نوید صبح بہاراں سنا نہ اے بلبل
ہمیں تو شام کے افکار کھائے جاتے ہیں
کسی نے نغموں میں بھردی تھی زندگی اپنی
اسی کی لے میں وہی گیت گائے جاتے ہیں
نفس نفس میں ہے اک امتحان عزمِ حیات
جو چشمے پھوٹتے دریا بنائے جاتے ہیں

مقام اپنا مقامِ خودی میں پنہاں ہے
غلامی دل کی نہیں ہے یہ خواجگی اپنی
خودی میں زیست ہے، عزت ہے، عشق و مستی ہے
خودی ملے تو مسرت ہے دائمی اپنی

رازِ گلشن ہی کو افسوس نہ سمجھا تو نے
خارزاروں میں بھی خوشیوں سے گزر ہوتا ہے

جس سے ہر ذرہ ہوا روزِ ازل مست الست
میرے ہاتھوں میں اسی شوق کا پیمانہ تھا

مسلک عشق کے طوفاں کے تھپیڑوں میں حیات
خواہش عشق کہ طوفاں بھی کنارہ ہوتا

کچھ ایسی مجھ کو پلا دے مئے طہور خودی
ہو جان لب پہ ، لب آلودۂ سوال نہ ہو
وہ آہ کیا ہے جو پتھر کو نرم کرنہ سکے
ہنر ہنر ہی نہیں جس میں کوئی کمال نہ ہو

میں کیا ڈھونڈتا ہوں یہ پوچھو نہ مجھ سے
کہاں ہوں میں اپنی خبر چاہتا ہوں
نہیں روزِ روشن کی مجھ کو تمنا
شبِ غم کی اپنی سحر چاہتا ہوں

PDF Compressor Free Version

تو آقا ہے میرا عطا کردے مجھ کو
غلامیٔ خیر البشرؐ چاہتا ہوں

یا رہئے آستانِ محبت پہ سجدہ ریز
یا سر کسی کے آگے جھکانا نہ چاہئے

ہو جایئے گا آپ بھی پروردۂ جمال
میری نظر سے آئینہ دیکھا نہ کیجئے
میں ہو ں غلام یعنی کہ پروردۂ کرم
محرومِ لطف حشر میں شاہا نہ کیجئے

دیکھنا مجھ کو بھی اے ناوک فگن کہ ہے بلند
حوصلہ میرے جگر کا یا کہ تیرے تیر کا
اشک کے دھارے نہیں تحریر لوحِ قدس ہیں
درد و سوز وعشق ہے عنوان اس تحریر کا

فکر ونظر کو مائل طوفاں نہ کر سکے
ایسا کوئی چراغ فروزاں نہ کر سکے
کوئی درست ہم کبھی ساماں نہ کر سکے
دامن سیا تو فکر گریباں نہ کر سکے

جہادِ زیست کا جو قوم ساتھ دے نہ سکی
اسی کے حصے غم و نالہ و فغاں ہوگا
نہیں سوالِ زباں ، ہے سوالِ مرگ وحیات
مٹی جو اردو ٹھکانہ مرا کہاں ہوگا

اتنے اشعار رقم کرنے کے بعد بھی گراں قدر اشعار کی ریل پیل سامنے ہے۔ کئی غزلیں ایسی ہے کہ جن کے تمام اشعار معیاری اور اپنی مثال آپ ہیں، پھر وہ نظمیں ہیں جو غزل نما ہیں، ان کی خواندگی الگ انداز میں لطف اندوز کرتی ہے۔ یہ مجموعہ اچھی شاعری کا ایک اچھا نمونہ ہے جسے حرزِ جاں بنایا جانا چاہئے اور داد دینی چاہئے کہ ایک قصباتی آبادی میں اس انداز اور معیار کی شاعری کرنے والے صف بہ صف کھڑے ہیں۔

ان خادمین شعروادب کے ساتھ جو ناانصافی ہوئی ہے وہ ناقابل معافی جرم کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک غزل کے چند اشعار کی پیش کش پر میں ختم کلام کرتا ہوں۔

وہ کون تھا جسے یوں بخش دی زمانے نے
بغیر رزم جہاں میں کہیں پناہ بھی ہے
اٹھو ، سنبھالو ، قدم کو ، سفر شروع کردو
کہ عزم راہ میں منزل بھی اور راہ بھی ہے
مٹاتا ہے جو زمانہ تو بے قصور نہیں
جہاں میں ضعف سے بڑھ کر کوئی گناہ بھی ہے
جو بے عمل ہوئی وہ قوم مردہ ہو بیٹھی
اسی کے حصے میں ذلت بھی ، درد وآہ بھی ہے
یہ مانتا ہوں کہ مومن ہو ، شان والے ہو
تمہارے ہاتھوں میں شمشیر لا الہ بھی ہے
وہ ایک سجدہ کہ ہے رقص روح کا حاصل
حریم ناز بھی ہے تیری بارگاہ بھی ہے
کھلے نہ آنکھ تو اے درد اس کو کیا کہئے
کہ ٹھوکروں ہی میں حیرت بھی نگاہ بھی ہے

❁❁❁

حسن خیال

☆ روغن آٹے میں کبھی ضائع نہیں ہوتا ہے
☆ بدترین بختی وہ ہے جو ہنسانے والی ہو
☆ سخاوت پھل ہے مال کا، اعمال پھل ہیں علم کے اور خوشنودی پھل ہے اخلاص کا
☆ تجربے کے بغیر کتابی علم اندھا ہے
☆ پاپ نہ کرنا گویا دنیا کی بھلائی کرنا ہے
☆ ہر غم کشادگی کی طرف لے جاتا ہے یعنی مصیبت کے بعد آرام وراحت ہے
☆ اعلیٰ دماغ کے سو ہاتھ ہوتے ہیں

PDF Compressor Free Version

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

Kohsaar, Bhikanpur 3, Bhagalpur 812001

سہیل عظیم آبادی کی مکتوب نگاری

خط نویسی کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اس سلسلے میں چند روایات بھی پائی جاتی ہے۔ قدیم رومی عورتوں کو جب اپنے عاشق کو خط لکھنا ہوتا تھا تو وہ ایک طرح کے دودھ سے اپنی نوکرانیوں کی ننگی پشت پر خط لکھتی تھیں تاکہ کوئی دوسرا اسے پڑھ نہ سکے۔ چپ وہ نوکرانی اپنی مالکن کے عاشق کے پاس پہنچتی تھی تو اس کی پشت پر کوئلے کا سفوف چھڑک کر عاشق خط پڑھ لیتا تھا۔ مانچسٹر کے پادری بشپ فریز رنے محبت کے اتنے خطوط لکھے جن کی تعداد اوسطاً بارہ فی یوم ہوتی ہے۔ صرف ۱۸۷۹ء میں اس نے ۴۵۲۹ خطوط لکھے تھے۔ دوسری عالمی جنگ کے زمانے میں شیل کینیڈی نام کی لڑکی نے برطانیہ میں اپنے محبوب کو ہر روز اوسطاً سات ہزار الفاظ کے خطوط لکھے۔ اسی طرح انگریزی فوج کے ایک کارپول کارڈف اور انگلستان میں رہنے والی اس کی محبوبہ نے ۱۹۴۰ء سے جنگ کے خاتمے تک ایک دوسرے کو ۳۶۰۰ خطوط لکھے۔ اردو میں بھی مکتوب نگاری کا رواج بہت قدیم ہے، مگر تفصیل یہاں بے محل ہے۔

سہیل عظیم آبادی کے خطوط روایتی انداز میں اپنی ہم سفر یا محبوبہ خاص سے منسوب نہیں تھے، بلکہ انہوں نے ہزاروں خطوط ادیبوں شاعروں اور قلم کاروں کو لکھے تھے۔ ان میں شعر وادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اور اردو زبان وادب کو پروان چڑھانے والوں کے لئے بہت سا مواد موجود ہے۔ موضوعی تفصیلات میں اور شخصی اور اجتماعی زندگی کے مسائل میں تنوع ہے۔

سہیل عظیم آبادی کی بڑی خواہش تھی کہ کسی رسالہ کا ''سدرشن نمبر'' نکلے، اس سلسلے میں انہوں نے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو کئی خطوط لکھے تھے:

''اب میری کوشش ہے کہ کوئی رسالہ 'سدرشن نمبر' نکال دے۔ پریم چند پر کافی کام ہو رہا ہے۔ اس طرح ابتدائی دور کے افسانہ نگاروں پر کافی مواد اکٹھا ہو جائے گا۔ آپ کی کوششوں سے سجاد حیدر یلدرم نمبر پہلے ہی شائع ہو چکا ہے۔ اب ایک نیاز رہ جائیں گے، لیکن شاید وہ خود ہی اپنے بارے میں ایک نمبر شائع کر دیں، یہ بہت ممکن ہے اور انہیں کرنا چاہیے، یا پھر کوئی نکالے گا ہی۔ البتہ وہ پاکستان چلے گئے۔ اعظم کریوی بھی پاکستان چلے گئے تھے۔ اس طرح پہلے دور کے افسانہ نگاروں کی بات ختم ہوئی۔ اس کے بعد کے لوگوں پر ابھی بہت کچھ لکھنا اور کرنا باقی ہے۔'' (مکتوب، مورخہ ۳۱ر مارچ ۱۹۶۵ء)

پروفیسر نارنگ کے نام ایک اور خط اس طرح ہے:

''نمبر نکالنے اور نکلوانے میں آپ بہت آگے تھے۔ اب میں نے یہ کام شروع کر رکھا ہے، میری کوشش ہے کہ ''سدرشن نمبر'' بھی شائع ہو اور اس کے لئے میں نے ''محور'' (دہلی) کے ایڈیٹر نشجل کو رضامند کر لیا ہے۔ اب اگر موقع ہو تو ایک مضمون سدرشن صاحب پر لکھئے اردو افسانوں پر ان کا احسان ہے اور یہ عجیب بات ہے کہ پریم چند اردو سے ہندی میں آئے تو دونوں نے ان کو اپنا مانا اور کہا، لیکن سدرشن جی کو دونوں نے Disown کر دیا اور وہ بھی خاموش ہو رہے، لیکن اس کی وجہ سے ان کی خدمات کو تو نہیں بھلایا جا سکتا۔ آپ کا کیا خیال ہے، میں تو انہیں نہیں بھول سکتا، اس لئے کہ ابتدا میں انہوں نے میری بڑی ہمت افزائی کی ہے اور جائز طور پر میں سمجھتا

PDF Compressor Free Version

ہوں کہ ان کی خدمات پر روشنی ڈالنے کے لئے ایک نمبر شائع ہونا چاہیے، ابھی تک انہیں جاننے والوں میں لوگ باقی ہیں اور کافی مواد اکٹھا کیا جاسکتا ہے، بعد میں سب ضائع ہوجائے گا۔ کیا آپ ایک مضمون لکھیں گے۔"

(مکتوب مورخہ ۱۵/اپریل ۱۹۶۵ء)

خطوط سے سہیل عظیم آبادی کی شخصیت کو بہ آسانی پڑھا جاسکتا ہے۔ وہ بے تکلف ہوکر لکھتے ہیں اور ان کے سوچنے کا زاویہ، ذہن کی افتاد، فطرت کے پیچ وخم، طبیعت کی سادگی یا پرکاری فوراً معلوم ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹاچاریہ کو لکھتے ہیں:

"میں بنگال میں اردو اکادمی کے قیام کا خواہشمند اس لئے ہوں کہ بنگالی ادب کا قیمتی سرمایہ اردو میں منتقل ہوسکے۔ بنگال میں اردو سرمایہ ہے ضرور، لیکن اس سے زیادہ اہم اور قیمتی بنگالی ادب کا سرمایہ ہے، جو اردو میں منتقل ہوجائے تو اردو کی دولت میں اضافہ ہو، خاص کر ڈی۔ ایل۔ رائے بنکم چٹرجی، ٹیگور اور سرت چندر چٹرجی کی تخلیقات۔ مجھے سرت بابو کے ناولوں سے عشق ہے۔ میں بڑی ایمانداری کے ساتھ سمجھتا ہوں کہ اپنے عہد کے وہ دنیا کے سب سے بڑے ناول لکھنے والے تھے اور بیسویں صدی کی سب سے بڑی ادبی بے ایمانی یہ ہے کہ انہیں نوبل پرائز نہیں ملا۔ بڑے بڑے نام جن کو نوبل پرائز ناول نویس کی حیثیت سے ملا، سرت بابو کے سامنے طفل کتب ہیں اور اب تو خیر ادب کا نوبل پرائز سیاسی انعام بن کر رہ گیا ہے۔"

(مکتوب مورخہ ۸/اپریل ۱۹۷۵ء)

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میں ادب میں سودخوری کا قائل نہیں ہوں۔ اگر میں نے لکھنا بند کردیا ہے تو میرا نام نہیں آنا چاہیے بلکہ نام اس کا آنا چاہیے جو لکھ رہا ہے۔ اگر خراب لکھتا ہے تو یہی کہو، لیکن اس کے وجود کا اقرار کرو۔ البتہ میرا مطالبہ Seriousness کا ہے۔ نوجوانوں سے بھی، ہمارے نوجوان بہت تجربے کر رہے ہیں، سارے تجربے خوبصورت نہیں اور نہ سارے تجربوں کے نتیجے اچھے ہوں گے، لیکن تجربے تو ہونے ہی چاہیے۔ تجربوں سے اچھے اور برے نتیجے اخذ ہوتے ہیں اور انہیں نتیجوں کی بنا پر فارمولے بنتے ہیں، تجربوں سے اچھی چیز نکلی تو زندہ رہے گی اور اگر بے معنی چیز برآمد ہوئی تو از خود ردی کی ٹوکری میں چلی جائے گی۔ نئی نسل پرانی نسل کے مقابلہ میں ہمیشہ طاقتور رہی ہے۔ اس میں Vigor زیادہ ہوتا ہے۔ ہم سب کسی زمانے کے باغی تھے۔ کبھی ہم نے اپنے بزرگوں سے بغاوت کی تھی، اب عزیزوں کی بغاوت سے کیوں گھبرائیں، اگر ادب میں باغیوں کی پیدائش بند ہوجائے تو جمود پیدا ہوجائے گا۔ سڑاند پیدا ہوگی۔" (مکتوب مورخہ ۲۵/مئی ۱۹۶۷ء)

سہیل عظیم آبادی کے خطوط سے نجی حالات اور بہت سی وہ باتیں معلوم ہوجاتی ہیں، جو وہ عام حالات میں لکھنا پسند نہیں کرتے، ساتھ ہی ان کی بے تکلفی کے باعث استدلال کا انداز، اسلوب کی بے ساختگی اور زبان پر قدرت کا حال کھلتا ہے۔ شفیقہ فرحت کے نام خط میں لکھتے ہیں:

"دلی کی مختصر ملاقات کا مجھے واقعی بہت رنج ہے، میں تم لوگوں کی کوئی خاطر بھی نہ کرسکا۔ بیوی بھی نہیں تھیں کہ گھر آنے کی دعوت دیتا، لیکن اس کے علاوہ تم لوگوں کے پاس بھی وقت کم تھا۔ اگر پہلے ملتیں تو میں ہوٹل میں ہی ایک وقت اچھا سا کھانا کھلا دیتا، لیکن تم لوگوں کی کوئی خاطر نہ کرسکا۔ نہ جانے تم کیا خیال کرتی ہوگی، کنجوسی یا بداخلاقی۔ واقعی مجھے بڑا افسوس ہے۔ خدا کرے پھر دہلی آؤ تو مجھے تلافی کا موقع مل جائے۔"

(مکتوب مورخہ ۷/مارچ ۱۹۵۸ء)

سہیل عظیم آبادی نے اکثر اپنے خطوط میں ناقدانہ بصیرت کا ثبوت دیا ہے اور اردو ادب پر اپنی گہری نگاہ کا ثبوت پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

PDF Compressor Free Version

''میرے خیال میں ممتاز مفتی کا سب سے اچھا افسانہ 'آپا' ہے، لیکن وہ بڑی حد تک سرت چندر چٹرجی کی 'بڑی دیدی' کا چربہ ہے، بہرحال پھر بھی وہی اچھی کہانی ہے۔''

(مکتوب مورخہ ۲۰ر مارچ ۱۹۶۵ء)

عبدالقیوم ابدالی کے نام درج ذیل ایک خط سے ان کے تجزیاتی انداز کی وضاحت ہوتی ہے:

''ڈاکٹر اختر کی کتاب میں نے پڑھی ہے۔ مجھے تو اس مضمون میں کوئی برائی نظر نہیں آتی۔ اس میں فحش کیا ہے۔ اس بیچارے نے اردو کے ان افسانوں کا جائزہ لیا ہے، جن میں لس بین ازم کی تصویریں ہیں۔ ان افسانوں کا تجزیہ کیا ہے، لس بین ازم ایک نفسیاتی کج روی ہے اور بہت سی عورتوں میں جو کم عمری میں بیوہ ہو جاتی ہیں اور ان کا دوسرا بیاہ نہیں ہوتا، یہ عورتیں بدنامی سے بچ کر اس طرح اپنی جنسی تسکین کا سامان مہیا کر لیتی ہیں۔ جب یہ علت موجود ہے تو افسانوں اور ناولوں میں اس کا ذکر بھی ضرور آئے گا اور جب افسانوں میں ذکر آئے گا تو مضامین میں بھی ذکر آئے گا ہی، یہ ایک حقیقت کا ذکر ہے فحاشی نہیں، بشرطیکہ لذت اٹھانے کے لئے نہ کیا جائے۔'' (مکتوب مورخہ ۲۹ر دسمبر ۱۹۷۷ء)

سہیل عظیم آبادی فن کے نام پر رجعت پرستی کے فروغ کو ادبی خطرہ سے تعبیر کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کسی بھی ادبی صنف کی اساس، فنی ضرور ہونی چاہیے، لیکن سماج سے اس کا رشتہ منقطع نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے ادبا اور شعرا جو ادب برائے ادب کی اوٹ میں غیر سماجی عناصر کو بڑھاوا دے رہے تھے ان سے وہ کسی طرح بھی مصالحت نہیں کر سکتے تھے، منظر شہاب کے نام ایک خط میں رقمطراز ہیں:

''پاکستان کے ادیبوں نے جنس کا چولا بدل لیا ہے۔ مثلاً منٹو، ممتاز مفتی وغیرہ، لیکن سب نے نہیں، ساحر لدھیانوی وغیرہ وہیں ہیں جہاں پہلے تھے، لیکن یہ ضروری ہے کہ ان لوگوں کے لئے وہاں بڑی مصیبتوں کا سامنا ہے۔ ان کے لئے سخت آزمائش کا وقت ہے۔ حسن عسکری اور ان کے چند ساتھی وہاں کے چند ترقی پسند ادیبوں کے خلاف مستقل جاسوسی کا کام کر رہے ہیں اور اخباروں اور رسالوں میں ترقی پسندوں کے خلاف مضامین لکھ کر عوام اور حکومت کو ابھار رہے ہیں۔ ہفتہ وار 'نظام' (لاہور) میں تین ماہ تک ایک بحث چلتی رہی جو میرے ایک خط سے شروع ہوئی۔ یہ بحث سخت اور تیز ہو گئی تھی، کشمیر کے سلسلے میں پاکستانی ادیبوں کی اپیل کا جواب میں نے لکھا تھا اور 'نیا ساز' (کپور تھلہ) میں شائع ہوا تھا۔ صمد شاہین جیسے پہلے تھے ویسے اب بھی ہیں۔ مجھے ان کے پاکستان یا قائداعظم کی تعریف کرنے پر اعتراض نہیں، لیکن ہندوستان کے خلاف معاندانہ انداز پر اعتراض ضرور ہے۔'' (مکتوب مورخہ ۱۴ر اکتوبر ۱۹۴۸ء)

سہیل عظیم آبادی کے خطوط کے مطالعہ سے قربت اور یگانگت پیدا ہوتی ہے۔ ان تحریروں سے نہ صرف ان کے طرز احساس کو سمجھنے اور ان کی انفرادی کاوشوں کو جاننے کا موقع ملتا ہے بلکہ مختلف ادبی رجحانات سے واقفیت بھی ہوتی ہے، ان کے خطوط میں درج باتوں کے تعلق سے دوسری ادبی اور سماجی شخصیتوں کے بارے میں بہت سی اہم اور نئی معلومات حاصل ہوتی ہیں، ان خطوط میں جو ضمنی مباحث، علمی لسانی اور ادبی نکات آ گئے ہیں وہ بھی کم اہمیت نہیں رکھتے۔ ان میں اہم جزئیات اور تفصیلیں موجود ہیں۔

ضروری اطلاع

زبان و ادب کی خریداری کے لئے آپ زرسالانہ سورو پے براہ راست اردو اکادمی کے اکاؤنٹ میں بھی ڈال سکتے ہیں، لیکن رقم بھیجنے کی جانکاری اکادمی کو ضرور دیں۔

Bihar Urdu Academy

SB A/c No. 440810100006014

IFSC Code- BKID0004408

PDF Compressor Free Version

کوثر مظہری

Dept. of Urdu, Jamia Millia Islamia, New Delhi 110025

راسخ عظیم آبادی کا رنگ تصوف

راسخ عظیم آبادی کا پورا نام شیخ غلام علی اور پیدائش ۱۱۷۸ھ/۱۷۶۴ء (بمطابق قاضی عبدالودود) اور جائے پیدائش پٹنہ سیٹی ہے۔ ان کے استادوں میں شرر، تپاں اور سودا کا نام بھی آتا ہے، لیکن شروع میں انہوں نے فدوی سے اصلاح لی تھی جس کا اعتراف غزل کے ایک مقطع میں کیا بھی ہے۔ میر کی شاگردی کے حوالے سے کئی اشعار ملتے ہیں، دو آپ بھی ملاحظہ فرمالیں ۔

جناب میر کا شاگرد ہے وہ
خوشا انداز راسخ کے سخن کا

شاگرد ہیں ہم میر سے استاد کے راسخ
استادوں کا استاد ہے استاد ہمارا

اب اگر میر کی شاگردی کا شرف حاصل تھا تو کچھ مماثلتیں بھی ہوں گی۔ یہاں اس تقابلی مطالعے کا نہ موقع ہے نہ اس کی گنجائش، لیکن صرف دو اشعار پیش کر کے اشارہ کر دینا چاہتا ہوں ۔

برق سے پوچھا کہ شادی کتنی اس عالم کی ہے
کچھ کہا اس نے نہ، لیکن اک تبسم سا کیا

مت چشم کم سے دیکھ مری چشم تر، کہ ہے
اے ابر اس حباب میں دریا چھپا ہوا

پہلے شعر کو میر کے اس شعر کے ساتھ پڑھیے ۔

کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

دونوں میں بے ثباتی عالم کا ذکر ہے۔ میر نے کسی سے پوچھا نہیں بلکہ چلتے پھرتے صرف کہا یا ذکر کیا جسے کلی نے سن لیا اور تبسم کر کے جواب دیا یعنی کلی پھول میں مبدل ہوگئی جو اس کی زندگی کے اختتام کا اشاریہ بھی تھا۔ دوسری طرف راسخ نے برق سے یعنی بجلی سے دنیا کی خوشی کے بارے میں پوچھا تو وہ چمک کر رہ گئی، کچھ جواب نہیں دیا۔ دونوں میں جو لطیف سا فرق ہے وہ طرز اظہار کی نزاکت کا ہے۔

دوسرے شعر میں چشم تر اور گریہ وزاری کی شدت بھی ہے اور ابر پر اپنی فوقیت بھی دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ میر کی غزلوں میں اس نوع کی مثالیں بھری پڑی ہیں جن میں آہ و زاری یا خون آلود اشک باری کا ذکر ملتا ہے۔ تین شعر میر کے دیکھئے ۔

میں گریۂ خونیں کو روکے ہی رہا ورنہ
اک دم میں زمانے کا یاں رنگ بدل جاتا

جیب و کنار سے تو بڑھا پانی دیکھیے
چشمہ ہماری چشم کا رہتا ہے جوش پر

دیدۂ تر کو سمجھ کے اپنا ہم نے کیا کیا حفاظت کی
آہ نہ جانا روتے روتے یہ چشمہ دریا ہوگا

اندازہ یہ ہوتا ہے کہ راسخ نے اپنے استاد سے یہ مضمون مستعار بھی لیا اور اسے چمکایا بھی۔ ایسے اشعار راسخ کے دیوان میں اور بھی ہیں، لیکن چوں کہ یہاں اس کا محل نہیں ہے اس لیے اس زاویۂ بحث کو یہیں ختم کیا جاتا ہے۔

عرض یہ کرنا ہے کہ راسخ نے میر کے تتبع میں بہت سی غزلیں اور بہت سے اشعار کہے، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا راسخ کی اپنی کوئی شناخت نہیں؟ میرے خیال میں راسخ کے یہاں خارجی عوامل کو داخلی طور پر Assimilate کرنے اور پھر انھیں شعری پیکر میں ڈھال کر پیش کرنے کا جو عمل ہے، وہ ان کا ذاتی تخلیقی طریقۂ کار ہے۔ جہاں میر

PDF Compressor Free Version

سادہ بیانی سے کام لیتے ہیں، راسخ اکثر پیچیدہ ترکیبوں سے پیکر ابھارتے ہیں۔ پروفیسر عبدالمغنی کے بقول:

"میر کے سائے میں ہوتے ہوئے بھی یہ اپنی الگ توانائی و زیبائی رکھتا ہے۔ اس میں صرف داخلی مطالعہ کا بوستاں نہیں ہے، خارجی مشاہدات کا گلستاں بھی ہے، دروں بینی کے ساتھ ساتھ جہاں بینی بھی ہے، باغ دل کے ساتھ باغ عالم کے دریچے بھی کھلے ہوئے ہیں اور دونوں طرف کے چمن کی ہوائیں مل کر ایک نغمہ دو رنگ پیدا کر رہی ہیں۔" (بہار کے چند نامور شعرا، مولفین: مظفر مہدی، منصور عمر، ۱۹۹۸ء، دربھنگہ، ص ۱۸)

راسخ کی شاعری میں جو دو طرح کے دھارے دکھائی دیتے ہیں، ان کی طرف پروفیسر عبدالمغنی نے بہت ہی واضح اور مناسب اشارہ کر دیا ہے۔

موضوعات اور مضامین کی سطح پر اگر دیکھا جائے تو راسخ عظیم آبادی کی غزلوں میں دنیا کی بے ثباتی، تصوف، عشقیہ رنگ، آہ وزاری، آرائش کائنات، محبوب کے حسن و جمال سے لے کر جذبات انسانی کے اہم تلازمات تک کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ سارے موضوعات کا احاطہ کرنا مشکل ہے، اس لیے یہاں تصوف کے اہم نکات وحدت الوجود یعنی وجود مطلق، دنیا اور یہاں کے مال و متاع سے بے نیازی، دنیا کی حقیقت جیسے مضامین کی چھان پھٹک کی جائے گی۔

ذات مطلق کی تمام تر جلوہ گری اور اس جلوہ گری میں اسی ذات مطلق کو دیکھنا اور سمجھنا وحدت الوجود ہے۔ چونکہ وحدت الوجود پر مضمون لکھنا مقصود نہیں، لہٰذا اشعار پیش کرتے ہوئے اس کے انسلاکی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی جائے گی۔ غزل کے بجائے مثنوی "کشش عشق"، حمد حضرت باری عزاسمہٗ کے دو شعر لیجیے ۔

اُسے سب میں پایا پہ سب سے بری
زہے اس کا اندازِ جلوہ گری
تجلی کی اُن نے نئی طرح سے
لباس اُن نے بدلے کئی طرح سے

پہلے شعر کا پہلا مصرع بہت اہم ہے: "اُسے سب میں پایا پہ سب سے بری"، یعنی تمام اشیا میں اس کی موجودگی ہے، مگر سب سے الگ بھی ہے، یہاں پر ذات مطلق میں ضم ہو کر اپنے وجود کی بے معنویت کی نفی بھی کی گئی ہے۔ دنیا کے تمام مظاہر اُسی ذات مطلق کے ظہور کے لیے ہیں۔ یہ چاند، سورج، آسمان، زمین، ستارے، دریا، پہاڑ، پھول اور شجر یہ تمام اُسی کے مظاہر ہیں۔ راسخ کا یہ شعر دیکھیے۔

جس طرح ماہ مقتبس نور مہر ہے
چہرے سے تیرے مہر کو یوں کسب نور تھا

چاند کی اپنی روشنی نہیں ہوتی بلکہ وہ سورج سے کسب نور کرتا ہے۔ راسخ کہتے ہیں کہ اسی طرح یہ سورج بھی اپنی روشنی کہاں رکھتا ہے، وہ تو تیرے چہرے یعنی ذات مطلق کے منبع انوار سے روشنی کسب کرتا ہے۔ اسی مضمون کو میر نے کسی خاص مظہر کے بجائے تمام اشیا کے نور میں جلوہ گر ہونے کی بات کی ہے۔ راسخ نے چاند اور سورج کی مثال پیش کر کے اس مضمون کو سریع الفہم بنا دیا ہے، یہ الگ بات ہے کہ "مقتبسِ نور مہر" کی ترکیب سے شعر کا پہلا مصرع ثقیل ہو گیا ہے۔ راسخ کے استاد میر کا یہ شعر بھی ملاحظہ کر لیجیے ۔

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اس ہی کا ذرہ ظہور تھا

راسخ کی یہ غزل میر ہی کی زمین میں ہے۔ اوپر راسخ کا جو شعر پیش ہوا، اس کے اوپر بھی اسی مضمون کا یہ شعر ہے، لیکن مجرد کردار بدل گئے ہیں ۔

ہیجدہ ہزار آئینوں میں جلوہ گر ہوا
اُس خوش نما کو میرے یہ شوق ظہور تھا

ہزاروں آئینے میں ذات مطلق کی جلوہ گری ہے اور ایسا اس لیے ہے کہ اس خوش نما یعنی ذات مطلق کو یہ شوق ہوا کہ وہ دیکھا جائے۔ یہی مضمون اور بھی واضح انداز میں ایک دوسری غزل کے اس مطلعے میں یوں ظاہر ہوتا ہے ۔

عرض کرنا تھا بوسے اُس کو اپنی شان کا
اس لیے واضح ہوا آئینۂ اعیان کا

خدا اپنے جمال کو بہت دنوں تک پردۂ خفا میں نہیں رکھ سکتا۔ راسخ کہتے ہیں ۔

مستوری و حسن کب تک آخر
بھایا ان کو ظہور اپنا

یعنی یہ کہ حسن مستور نہیں رہ سکتا۔ خدا نے یہ ظہور بشکل کائنات یا عالم اس لیے کیا کہ وہ خود اپنے آپ کو یا اپنے حسن کو دیکھنا چاہتا ہے۔ یہیں پر یہ مشہورِ زمانہ حدیث بھی ملاحظہ کر لیجیے کہ:

اَللّٰہُ جَمِیْلٌ وَیُحِبُّ الْجَمَال

اردو کے دو تین اشعار دوسرے شعرا کے بھی ملاحظہ کر لیجیے۔

ڈھونڈے ہے تجھے تمام عالم
ہر چند کہ تو کہاں نہیں ہے

(درد)

تھا وہ تو رشکِ حورِ بہشتی ہمیں میں میرؔ
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا

(میر)

معمور ہو رہا ہے عالم میں نور تیرا
از ماہ تا بہ ماہی سب ہے ظہور تیرا

(نیاز بریلوی)

راسخؔ نے اس وحدت الوجود کے مضمون کو طرح طرح سے پیش کیا ہے۔ اس مضمون میں آئینے اور پردے کا ذکر بھی ہوتا آیا ہے۔ نقش اور نقاش کا استعمال کر کے بھی راسخؔ نے اس مضمون کی ایک اور جہت کو پیش کیا ہے۔

معنی کے تئیں ہم نے تو صورت ہی میں پایا
نقاش ہمیں نقش کے اندر نظر آیا

صورت اور معنی کی بحث ہوتی رہی ہے۔ جس نقاش نے یہ صورت گری کی ہے، دراصل اس کی شناخت نقش یا صورت ہی سے ہوتی ہے۔ راسخؔ اس نقاش کے روئے زیبا کے دیدار کے لیے کہتے ہیں کہ اپنے اندر سے خودی یعنی کبر و نخوت کا مٹانا ضروری ہے۔

یہ ہم سب جانتے ہیں کہ اقبالؔ سے پہلے اردو شاعری میں خودی کا مفہوم یہی تھا۔ راسخؔ کہتے ہیں۔

خودی ہے تیری نقاب اُس کے روئے زیبا کا
اٹھا دے اس کو اگر شوق ہے تماشا کا

اسی خودی اور کبر و نخوت کو راسخؔ نے ایک جگہ "بت پندار" بھی کہا ہے اور اہلِ تصوف کے یہاں اس بت پندار کا توڑا جانا بہت ہی اہم مانا گیا ہے۔

شیخ اس بت شکنی پر نہ ہو اتنا مغرور
تو نے توڑا نہیں اپنا بت پندار ہنوز

کبیرؔ نے بھی اسی بت پندار کے توڑنے کی بات کی ہے۔ بت پندار کو اہنکار سے بھی موسوم کرتے ہیں۔ کبیرؔ کے دو دوہے پیش کرتا ہوں۔

مایا تجی تو کیا بھیا مان تجا نہیں جائے
مان بڑے منی ورگلے مان سبن کو کھائے

(دولت تج دیا تو کیا ہوا، عزت کی چاہ نہیں جاتی، عزت کی چاہ میں بڑے بڑے فقیر اور منی ختم ہو گئے۔ اس نے سب کو کھالیا۔)

جِہنہ آپا، تِہنہ آپدا جِنہہ سنسے، تِنہہ سوگ
کہہ کبیرؔ کیسے مٹیں چاروں دیرگھ روگ

(جہاں اہنکار (آپا) ہے وہاں مصیبت ہے، جہاں شک ہے وہاں غم ہے۔ کبیرؔ کہتا ہے کہ یہ چاروں مرض گمبھیر ہیں، کیسے مٹیں گے؟)

اُس نقاشِ ازل یا ذاتِ مطلق کے پرتو کے لیے غور و فکر اور تامل و تدبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ راسخؔ اپنے باطن کی سیر کرنے کی بات بھی کرتے ہیں۔

طلسم تن کو تامل سے سیر کر غافل
بنانے والا بھی اس کا، اسی میں پنہاں ہے

شاید یہی وہ منزل ہے جہاں یہ حدیث قدسی بھی پیش کی جا سکتی ہے جو سفرِ سلوک کے لیے مشعلِ راہ ہے: مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ یعنی جس نے اپنے نفس کو پہچانا گویا اس نے اپنے رب کو پہچانا۔ راسخؔ اپنے باطن میں اترنے کی بات کرتے ہیں۔

بھٹک مت جو طالب ہے راہ خدا کا
تجھی میں تو جلوہ ہے اس خود نما کا

میرؔ نے اسی مضمون کو کچھ یوں پیش کیا ہے۔

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں ہی دور تھا

آیئے پھر ذاتِ واحد کے وجود کی بات کرتے ہیں جو کائنات اور اشیائے کائنات میں جلوہ گر ہے۔ راسخؔ نے اس حوالے سے آئینہ اور پردے کا استعمال بھی کیا ہے۔ راسخؔ افراطِ تجلی کو وجودِ مطلق کے لیے رخنۂ تصور کرتے ہیں، اسی لیے وہ کہتے ہیں۔

PDF Compressor Free Version

مانع دید ہے افراط تجلی ان کی
وے نظر آویں اگر تاب ہو بینائی کو

اگر ذات مطلق نظر نہیں آتا تو اپنی بینائی کا قصور ہے۔ میرؔ نے بھی کہا تھا ع

سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا

یہ دنیا جو شمل ایک پری خانہ کے ہے اُس کا صانع ایسا ہے جس کے لیے ہر عقل مند کے اندر دیوانگی ضروری ہے۔ راسخؔ کو سنیے۔

یہ پری خانہ جہاں کا، صنعت اک صانع کی ہے
حیف اس عاقل پہ جو یاں اُس کا دیوانہ نہ تھا

صوفیا کے یہاں دل کے تزکیے کی بات بہت کی جاتی ہے، اس لیے کہ خدا کا گھر دل ہی ہوتا ہے۔ اگر دل آلائشوں سے پاک نہیں تو رُخ یار سے محرومی مقدر ہوگی۔ اشعار دیکھیے۔

کاش یوں تیرہ نہ یہ آئینۂ دل ہوتا
صاف ہوتا تو رُخ یار کے قابل ہوتا

دلِ ناصاف کیوں کر جلوۂ معشوق کی جا ہو
تمنا ہے کسی صورت یہ آئینہ مصفا ہو

اہل تصوف کے نزدیک تزکیۂ نفس کے لیے لذت دنیا اور ہوس پرستی سے دوری ناگزیر ہے، اسی لیے راسخؔ نے بھی تصوف کے انسلاکی عوامل کو جگہ جگہ پیش کیا ہے۔

دل ہوس والوں کے محروم اُس کے پرتو سے رہے
جلوہ گاہِ داغِ جاناں سینۂ ابرار تھا

ہفت اقلیم کا خیال عبث
آرزوئے جہاں ستانی ہیچ

ترکِ لذات کی لذت نہ ہوئی ہم کو نصیب
یہ مزا کاش ہمارے تئیں حاصل ہوتا

راسخؔ تو کچھ ایسے شدت پسند بھی ہوجاتے ہیں کہ دنیا کو "قحبۂ رعنا" سے بھی موسوم کرنے میں گریز نہیں کرتے۔

جہاں ہے قحبۂ رعنا، تمہیں گر ہوتی بینائی
تو اے اہل جہاں اس کے تمنائی نہ ہوتے تم

سید امداد امام اثرؔ لکھتے ہیں:

"حضرت راسخؔ مرحوم فقیر طبیعت اور فقیر دوست آدمی تھے۔ اکثر شاہ باقر کے تکیے پر قیام رکھتے تھے۔ اہل دولت سے کم ملتے تھے، صحبت فقرا میں ہمیشہ رہتے تھے۔ تبھی تو ان کے کلام میں اس قدر مزا ہے۔ بے فقیر دل ہوئے نہ کلام پر تاثیر ہوا ہے نہ ہوگا۔"

(کاشف الحقائق، مرتبہ وہاب اشرفی، ص ۳۷۸)

دنیا اور اس کے حسن یا تعلق سے الگ ہونے کی بات تمام صوفی شعرا نے کی ہے، مگر خیال رہے کہ اسلامی تصوف میں بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اسلام میں رہبانیت کی گنجائش نہیں، اس کے ساتھ چلتے ہوئے وحدت وجود کے اقرار کو بحال کرنا ہوتا ہے۔ کبیر نے بھی دنیا، اس کی بھوک یا اس سے تعلق خاطر کو بھگتی کے لئے مضر سمجھا ہے۔

جب لگ ناتا جگت کا تب لگ بھگتی نہ ہوئے
ناتا توڑ ہر بھجے بھگت کھڑے سوئے

کبیر چھنھا ہے کوکری کرت بھجن میں بھنگ
بلکو ٹکڑا ڈار کے سمرن کرو نسنگ

(اے کبیر بھوک کتیا کی طرح ہے جو خدا کی یاد میں خلل انداز ہوتی ہے۔ اسے ایک ٹکڑا دے کر خدا کا ذکر اطمینان سے کرو)

آپ غور کیجئے کہ جہاں کبیر دنیا اور اس کی بھوک یا دنیا کے حرص کو کتیا گردانتے ہیں، راسخؔ اسے "قحبۂ رعنا" سے یاد کرتے ہیں۔ راسخؔ دنیا کی لذت اور ہفت اقلیم کے حصول کو قرب الٰہی کی راہ میں رخنہ اندازی تصور کرتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ دنیا کی لذت کا ترک کرنا مشکل ہے، لیکن اس میں جو مزا ہے اس کی تفہیم کے لئے ذوق صحیح کا ہونا لازمی ہے۔

مت کہہ کہ ترک لذت حسی قبیح تھا
وہ سمجھے یہ مزا جنہیں ذوق صحیح تھا

راسخؔ نے تصوف کے انسلاکی اور وحدت الوجودی عوامل و عناصر کو اپنی شاعری میں بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مرنجاں مرنج

(بقیہ ص ۵۵ پر)

PDF Compressor Free Version

ڈاکٹر سید احمد قادری

7, New Karimganj, Gaya

فصیح الدین بلخی کے تاریخی کارنامے

صوبہ بہار ہمیشہ سے علم وادب کا گہوارہ رہا ہے۔ سیاسی، سماجی، مذہبی، لسانی اور ادبی میدان میں ایک سے بڑھ کر ایک شخصیات نے اس سرزمین کو زرخیز کیا ہے، جن کی خدمات آج بھی کئی لحاظ سے مشعل راہ ہیں۔

اردو زبان وادب میں بھی گرانقدر کارنامے انجام دینے والوں کی ایک لمبی فہرست ہے اور اس لمبی فہرست میں فصیح الدین بلخی کا نام اپنی جملہ خصوصیات اور خدمات کی بنا پر سرفہرست ہے۔

لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ دوسرے صوبوں کو چھوڑیئے، خود اپنے صوبہ بہار میں اپنے اسلاف کے کارناموں سے نئی نسل واقف نہیں۔ وقت کی گرد دبیز ہوتی جارہی ہے اور بے حسی و بے عملی اپنی پوری شدت اختیار کئے ہوئے ہے۔ یہ بے حسی اور بے عملی مختلف افراد کے ساتھ ساتھ بہار کی مختلف انجمنوں پر بھی طاری ہے، ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ فصیح الدین بلخی کی برسہابرس کی محنت وتلاش وجستجو کے بعد شائع ہونے والی تاریخ ساز کتابوں مثلاً ''تاریخ مگدھ''، ''تذکرۂ نسواں ہند''، ''تذکرۂ ہند وشعرائے بہار''، ''پٹنہ کے کتبے''، ''وہابی تحریک'' وغیرہ میں سے کوئی کتاب میٹرک کی سطح سے لے کر ایم۔اے تک کے نصاب میں شامل نہ ہو۔ انتہا تو یہ ہے کہ ان کی کتابوں کے نسخے بھی اب بمشکل دستیاب ہیں۔

چند سال قبل خدا بخش لائبریری، پٹنہ نے ''تاریخ مگدھ'' کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر اسے دوبارہ شائع کیا ہے۔ غور فرمایئے، اتنی اہم کتاب جسے ۱۹۴۴ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی نے شائع کیا تھا، اس کتاب کے نسخے کی عدم دستیابی کو برسوں نہیں، کئی دہائی ہوگئے، لیکن بہار کے کسی بھی ادارہ یا فرد نے دوبارہ اشاعت کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ڈاکٹر محمد ضیاالدین انصاری، ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری، پٹنہ، یقینی طور پر لائق مبارکباد ہیں کہ انہوں نے اس کتاب میں بیان کئے گئے ۶۴۲ ق م سے لے کر ۱۹۴۳ء تک کے تاریخی، جغرافیائی، مذہبی، سیاسی اور سماجی حالات کی اہمیت اور افادیت کو تسلیم کرتے ہوئے ۲۰۰۱ء میں اسے دوبارہ شائع کیا اور وہ بھی اس وعدے کے ساتھ کہ:

''اس کا ہندی ترجمہ بھی استفادۂ عام کے لئے انشاءاللہ جلد ہی ہدیہ ناظرین کیا جائے گا۔''

خدا بخش لائبریری کے سابق ڈائرکٹر کی عنایت سے مجھے ''تاریخ مگدھ'' کے مطالعہ کا موقع ملا اور میں نے شدت سے اس امر کو محسوس کیا کہ ایسے وقت میں جب کہ تاریخ کو مسخ کرنے کی منظم سازش رچی جارہی ہے اور حسن عسکری، قیام الدین احمد اور رام شرن شرما، وشمبھر ناتھ پانڈے وغیرہ جیسے لوگ اب ہمارے درمیان سے اٹھتے جارہے ہیں، ایسے میں ایسی کتاب کو ہر مکتبہ فکر تک پہنچانے کی ضرورت ہے۔

مذکورہ کتاب میں بہت سارے ایسے حالات اور واقعات بیان کئے گئے ہیں، جن سے عام طور پر تاریخ کے طالب علم بھی واقف نہیں۔ مثلاً یہ کہ صوبہ بہار پہلے مگدھ دیس کے نام سے جانا جاتا تھا، جس کا نام آٹھویں صدی عیسوی کے آخر زمانے میں بدل کر بہار کردیا گیا، اس ملک میں اسلامی حکومت بھی قائم تھی اور اس دور میں بہت سارے فلاحی اور اصلاحی کام ہوئے، جو دور حاضر میں بھی اپنی مثال آپ ہیں۔

اس کتاب کے ہر صفحہ پر کوئی نہ کوئی، ایسی اہم بات ضرور ہے جو عہد حاضر کے لوگوں کے لئے نہ صرف علم وفہم میں اضافہ کرتی ہے، بلکہ انکشافات کا درجہ رکھتی ہے۔ بعض باتیں اس قدر حقائق پر مبنی اور مدلل ہیں کہ بہت ساری غلط فہمیاں دور کرنے میں بھی معاون ثابت ہوں گی، مثلاً ۱۹۴۰ء میں منعقد ہونے والے کانگریس کا رام گڑھ کا جلسہ، جس میں مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو اور صدر کانگریس کی حیثیت سے مولانا آزاد

PDF Compressor Free Version

وغیرہ شامل ہوئے تھے، اس جلسہ میں بارش ہوجانے کے سبب افراتفری مچ گئی تھی اور یہ جلسہ بھی رسمی طور پر ہوا، برعکس اس کے، مخالف گروپ کے سربراہ سبھاش چندر بوس نے اس روز رام گڑھ میں دوسرے مقام پر کامیاب جلسہ کیا۔ کانگریس میں پھوٹ اسی روز پڑی۔ یہ اطلاع بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری میں بہار کے مسلمانوں کی تعداد ۴۲۷، ۴۰، ۴۱ جب کہ ہمارے برادران وطن کی تعداد اس وقت صرف ۲، ۵۹، ۱۵۰۴ تھی۔

فصیح الدین بلخی کی بارہ برس کی سخت محنت، جانفشانی اور عرق ریزی کے بعد جو کتاب ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئی، اس کتاب کی جو قدر دانی ہونی چاہئے تھی، افسوس کہ وہ نہیں ہو پارہی ہے۔ خوف اس بات کا ہے کہ آنے والی نسلیں، بہت سارے حقائق اور صداقت سے لاعلم رہیں گی اور ان کے علم ومعلومات میں وہی باتیں آئے گی، جو عہد حاضر میں فرقہ پرست اور فاسسٹ ذہن کے لوگ پورے شدومد کے ساتھ بڑی تعداد میں پیش کررہے ہیں اور ایسی کتابیں آج بھی انگریزی اور ہندی زبانوں میں بڑی تعداد میں بازار میں موجود ہیں، جن میں تاریخ کے مختلف حالات، واقعات، حادثات اور سانحات توڑ مروڑ کر پیش کئے گئے ہیں۔

فصیح الدین بلخی کی دوسری بڑی اہم کتاب ''تذکرۂ نسواں ہند'' ہے جن لوگوں کی اس موضوع سے دلچسپی ہے اور جن کی نظروں سے ہندی، انگریزی اور اردو زبان میں اس موضوع سے متعلق ایسی کتابیں گزری ہیں، وہ بلخی کی اس کتاب کا بغور مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ بلخی نے اس کتاب میں حقیقتاً سمندر کو کوزے میں بند کیا ہے۔ ایسی نادر اور معلومات سے بھرپور کتاب کا ایک نسخہ اتفاق سے میرے پاس موجود ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ اس نایاب دستاویزی کتاب کو بھی دوبارہ شائع کیا جائے جس سے نئی نسل نہ صرف اپنی معلومات میں اضافہ کرسکے، بلکہ بہت ساری ایسی خواتین سے جنہوں نے مختلف میدان عمل میں کارہائے نمایاں انجام دیا ہے، ان سے واقف ہوسکیں۔ ہمارے مورخوں نے عام طور پر مختلف سیاسی، سماجی، مذہبی، لسانی اور ادبی طور پر عورتوں کے مقابلے مردوں کو ترجیح دی ہے اور ان کے کارناموں سے تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں، لیکن خواتین کے کارناموں پر نہ جانے کیوں توجہ مبذول نہیں کی گئی۔ ویسے تو ہزاروں خواتین ایسی ہیں، جن کے اندر کی خداداد صلاحیتیں اور فن گھر کی چہار دیواری میں قید ہوکر رہ گئیں۔ گھر گرہستی اور دیگر امور خانہ داری نے ان کے فن کو جلا نہیں بخشی اور نہ ہی ان کی ہمت افزائی ہوئی، نتیجتاً ان کے اندر کے فکر وفن نے دم توڑ دیا۔ ایسے میں بلخی نے اپنی کتاب میں ۲۸۶ شاعرات، ۵۴ مصنفات اور ۱۶ کاملات کے کمالات کو کتنی سخت محنت، تلاش وجستجو اور عرق ریزی کے بعد یکجا کیا ہے۔ یہ اپنے آپ میں کمال ہے۔

سن ۱۹۹۷ء میں بڑے پیمانے پر جشن آزادی کی پچاسویں سالگرہ منائی گئی اور سن ۲۰۰۷ء میں ایک سو پچاس سالہ جشن غدر ۱۸۵۷ء کی دھوم تھی۔ ان مواقع پر بڑے پیمانے پر کتابیں، رسائل، مجلہ، خصوصی نمبر وغیرہ شائع ہوئے لیکن بہار کی خواتین کے سلسلے میں ہمارے تاریخ داں اور تذکرہ نگار خاموش ہیں، جب کہ صوبہ بہار میں سینکڑوں کی تعداد میں ایسی خواتین کی مثالیں موجود ہیں، جنہوں نے مردوں کے مقابلے زیادہ شدت سے آزادئ ہند میں حصہ لیا اور عظیم قربانیاں پیش کی ہیں۔ صرف ایک مثال، ۱۸۵۷ء کے غدر کے موقع پر دی گئی قربانی کو پیش کرنا چاہوں گا، سہسرام کی حاجی بیگم کی، جنہوں نے خود تو انگریزوں سے مقابلہ کیا ہی، انہوں نے ویر کنور سنگھ کو اپنے سہسرام میں واقع محل میں پناہ بھی دی، بہار کی اس عظیم اور ناقابل فراموش خاتون کے نام کو بھی فراموش کردیا گیا۔ اس خاتون کے متعلق مشہور کالم نویس مسٹر آلوک مدوپ نے پٹنہ کے مشہور انگریزی روزنامہ ''انڈین نیشن'' میں لکھا تھا:

> ''برٹش فوج سے مقابلہ آرائی کے سلسلے میں سہسرام کی حاجی بیگم کے مجاہدانہ کارناموں کو آج کوئی نہیں جانتا، لیکن اگر ہندوستان کی تاریخ دوبارہ لکھی جائے تو یہ خاتون دوسری جھانسی کی رانی ثابت ہوگی۔'' (انڈین نیشن، پٹنہ ۱۰، نومبر ۱۹۷۲ء)

ان حالات کے پیش نظر ضرورت اس بات کی ہے کہ بلخی کی ایسی کتابوں کو بہار کے سرکاری ونیم سرکاری ادارے بڑے پیمانے پر شائع کرائیں اور نصاب میں شامل کرائیں، جس سے وقت کی دبیز گرد صاف ہو اور حقائق سامنے آئیں، ورنہ اسلاف کے سارے کارنامے وقت اور بے حسی کی دبیز گرد تلے دب کر ختم ہوجائیں گے۔

PDF Compressor Free Version

ڈاکٹر اقبال واجد

C/o Noman Mallick, 14 A, Aliganj, Gaya 823001

علیم اللہ حالی: چھٹی حس کا شاعر

علیم اللہ حالی کی شاعری حس سادس (چھٹی حس) کے درجہ اعلیٰ کی شاعری ہے جو ان کے تمام شعری اظہار پر اثر انداز ہے اور ان کے ایسے احوال و مقامات اور رنج والم کو افزائش عطا کرتی ہے جس کی تشریح و تعبیر کے لئے بسا اوقات خود نفس شاعر بھی عاجز اور متحیر ہے۔ اعلیٰ شاعری دراصل حس سادس ہی کی شاعری ہے۔ وہ ارفع و بسیط وجدانی کیفیات جو زندگی کے جملہ مسائل اور معارف کو کسی ایک وحدت میں ضم ہونے کے بعد تمام معانی کو کسی پر اثر یا غیر محسوس اور نادیدہ معانی سے دوچار کرتی ہیں، دراصل حس سادس ہی کی عطا کردہ ہیں۔

چھٹی حس دراصل صورت، شئے، صوت اور رنگوں کی ترتیب سے ادراک میں آنے والے تمام لمحوں، حسیت اور جزویات کی تردید اور اس حسیت اور جزویات سے ایک گونہ وفاقی ربط قائم رکھتے ہوئے گزر جانے یا گزرتے رہنے کی کیفیات میں ایک گم صم اور نامعلوم احساس و صورت گری سے عبارت ہے۔ حس سادس کی بنیاد علم اور تجربے پر نہیں ہے بلکہ اس کا رشتہ مکاشفہ اور احساس سے ہے۔ یہ حواس خمسہ کے مطالعہ سے قطع نظر ایک وہبی علم ہے جو قلب انسانی پر القا ہوتا ہے اور اس کی روح کو ایسے امور کی آگاہی عطا کرتا ہے جو لفظ و بیان کے سہارے مکمل خروج حاصل نہیں کر سکتی، مگر کسی یقین کی صورت، انسانی قلب میں جماؤ پیدا کرتی اور اپنے اثر و رسوخ سے انسانی نطق اور اس کے اظہار کے وسائل پر ایسے احساسات اور جمال پھیلا دیتی ہے جن سے اندرون قلب شرح و بسط کے ساتھ ساتھ ایک دائمی اور دانشمندانہ حزن پیدا ہوتا ہے۔ اس حس سادس کا عام اظہار کسی خصوصیت اور امتیاز کے بغیر بھی دیکھنے کو ملتا ہے، مگر اس کی اعلیٰ جہت اور نوع اپنے اندر ایک قدر مشترک رکھتی ہے۔ یہ قدر مشترک، اکثر غور و فکر اور مسائل پر مسلسل متوجہ رہنے سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ قدر مشترک دراصل زندگی کے متعلق وہ بنیادی سوالات ہیں جو عام انسانوں کے اذہان میں بھی پیدا ہوتے ہیں یا ہو سکتے ہیں، لیکن عام آدمی ان سوالات سے ایسی دلچسپی نہیں رکھتا جیسی دلچسپی ان سوالات سے خواص کو ہوتی ہے۔ یہ سوالات دائمی طور پر زندگی اور کائنات کی معنویت کی تلاش کے ساتھ ساتھ اپنی تکمیل اور اپنے بنیادی اصل و اصول کی تلاش ہیں۔ یہ تلاش مجموعی طور پر تمام اشیا کی حقیقت کے جاننے کا نام اور معدودی طور پر زندگی اور کائنات کے باطن کی تلاش ہے۔ مجھے کہنے دیجئے کہ یہ فکری مقام جو دائمی طور پر زندگی اور کائنات کے باطن یا اصل کو ہمیشہ سوالیہ نشان کی صورت میں دیکھتا ہے، ہر بڑے تخلیق کار یا شاعر کے یہاں جھلکتا ہے۔ خاص طور پر ایسے ادبا، شعرا اور فنکار جن کے کاموں کو عظیم کہنے میں کسی کو کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی ہو اس درجہ اعلیٰ پر فائز ہوتے ہیں اور وہ اپنی تخلیق میں ایسے خیالات لاتے ہیں کہ اس کے ذریعہ شئے اور شعور کی صداقت ابھر کر سامنے آئے اور قلب انسانی اس دائمی عارفانہ حزن و ملال سے لذت حاصل کر سکے جو اس آگہی کا خمیازہ ہے۔

علیم اللہ حالی کے تخلیقی عمل میں ایک ایسی حس سادس کا پتہ چلتا ہے، جو مافوق الاحساس ہے اور ماورائے خیال، زندگی کی کسی حقیقت، کسی آگہی، کسی جستجو، کسی معنی اور کسی زمانے کو اپنانے یا جاننے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ یہ نئی داخلیت علیم اللہ حالی کی نظموں کا حاصل ہے۔ علیم اللہ حالی کی اس نیم الہامیت کو کئی اجزا میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ یہی اجزا دراصل ان کی شاعری کی اساس ہیں۔ یہ اجزا مختلف نظموں میں کہیں کہیں تو قدر مشترک کے طور پر دکھائی دیتے ہیں اور کہیں قدر مفترق کی صورت میں، لیکن ان تمام جہتوں کو سمیٹ لیا جائے تو علیم اللہ حالی کی

PDF Compressor Free Version

شاعری کی ایک ہی جہت بنتی ہے جو حس سادس سے عبارت ہے اور اس کا جواز ان کی شاعری کے وہ اسرار اور مابعد الادراک کیمیائی کیفیات اور احساس و کیف کے خزائن ہیں جن سے مل کر ان کی شاعری کا پیکر تیار ہوتا ہے۔ ذیل میں علیم اللہ حالی کی شاعری کا سراغ لگاتے ہوئے ان حسیاتی مابعد الادراک استعاروں کو پیش کریں گے جو اردو کی جدید شاعری میں علیم اللہ حالی کی سند سے وجود پا رہے ہیں۔

(۱) وجد و استفہام :(ایک مجذوب جنگل میں بیٹھا مسلسل سر دھن رہا ہے۔)

وجد و استفہام کی کیفیت علیم اللہ حالی کی شاعری میں بھری ہوئی ہے وہ ہر چیز پر، ہر حال میں ہر معاملہ اور شرکت پر سر دھنتے نظر آتے ہیں، جیسے دنیا سے جی بھرا بھرا سا ہو یا خیال و عمل میں تفہیم و تلاش کے لئے کچھ باقی نہ ہو، اس وجد و استفہام کی جھلک علیم اللہ حالی کی بہت ساری نظموں میں دیکھی جا سکتی ہے۔

میں یوں ہی نام جپتا رہا/ اور ستاروں کو نیند آ گئی
میری مالا کے موتی کھسکتے رہے
صحن و دیوار پر تازہ تازہ شعاعیں بکھرنے لگیں
جانے کس کی لگن/ کون سی کھوج ہے/ کس کی چاہت ہے
کیسی چبھن/ صبح سے شام تک
ماہ و سال و صدی، ایک ہی مشغلے میں مگن
مضطرب جن کی لہروں پہ تشنہ دہن
اس سمندر میں ہوں غوطہ زن

(نامہ جہن)

علیم اللہ حالی کے اس وجد و استفہام کا ان کی حس سادس سے مخفی ربط ہے۔ یہ وجد ایک عارفانہ وجد ہے جو ہر مسئلہ کی تحصیل اور ہر اظہار کی تسخیر سے آزاد رہنا چاہتا ہے۔ اسی آزادی میں شاعر اپنی تخلیقی حسیت مکمل کر لیتا ہے اس کا یہ وجد ہر سوال کے لئے جواب اور ہر جواب کے لئے ایک سوال بن کر ابھرتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ علیم اللہ حالی کا یہ وجد و استفہام ان کی حس سادس کا عطیہ ہے جو قاری پر بھی بے خودی اور استفہام کا موڈ طاری کرتا ہے۔

(۲) مراقبہ اور سکوت :(صوفی مراقبے میں ہے)

علیم اللہ حالی کی شاعری میں دوسرا اہم تخلیقی ستون مراقبہ اور سکوت ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ پوری کائنات کے افہام و تفہیم اور زندگی کی حیرانی اور استفسار کے لئے ایک عہد میں مراقب ہو جانا اور سکوت اختیار کر لینا اپنے تخلیقی تناظر کی تمازت کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ مراقبے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے اظہار میں جو معانی اور حروف لاتے ہیں، ان معانی اور حروف سے پیدا ہونے والے تمام سوالات اور تمام واقعات یا احساسات اپنے آپ میں ایک تخلیقی اکائی کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان سے شاعر کے اندرون کا صرف ایک ہی تعلق سامنے آتا ہے اور وہ ہے ان سوالات، واقعات اور احوال پر ایک خاموشی، سکوت یا مراقبے کی کیفیت۔ چنانچہ ان کے یہاں ایسی بہت سی نظمیں ہیں جن کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر مراقبے میں ہے اور اسی مراقبے میں ہوتے ہوئے وہ اشیاء و اشکال کی حقیقت کا علم ظاہر کرتا چلا جا رہا ہے گویا وہ ہر شئے کو من و عن قبول کرتا ہے اور اس کے اصل و اصول کو سمجھنا چاہتا ہے۔ مراقبہ ہی اس کا عرفان ہے اور اسی سکوت میں وہ زمانے کے بڑے بڑے مسائل اور ذاتی احوال و کوائف کو بے حیثیت کر دیتا ہے۔ اس خاموشی اور سکوت کا اثر اس کی بہت سی نظموں پر طاری ہے۔ اس سلسلے میں اس کی تین نظمیں ''گہرائی سے ایک آواز''، ''واپسی'' اور ''امکان'' قابل ذکر ہیں۔ ''گہرائی سے ایک آواز'' میں علیم اللہ حالی اشیا کی حقیقت جاننے کے شوق میں ایک ایسی منزل پر مراقب ہیں جہاں سوالات ان کے مخصوص لہجے کے اظہار اور اس کے اثر میں unsolved بنے رہتے ہیں اور ان کے لئے کائناتی نظام کا فطری بہاؤ اور ربط بھی دراصل کسی غیر معمولی درد اور حصار کا شکار نہیں ہوتا بلکہ آسان درجے میں کسی ایک نقطے میں ضم یا حلول کر جاتا ہے، پھر تو گفت و شنید کے ذریعہ سے ایسے مسائل و سوالات کا بروئے کار لانا ہی ایک کار دشوار سے کم نہیں، چنانچہ ایسا ہوتا ہے کہ جب یہاں اور وہاں دونوں جہاں کی حقیقت پر کوئی سوال اٹھتا ہے تو وہ ان سوالات کے ذریعہ صرف اپنے لہجے کو بدلتا ہوا نہیں دیکھتے بلکہ وہ ایک ایسی سطح بھی خیال فرماتے ہیں جس میں ان کی اپنی آواز بھی باقی نہیں رہتی۔ وہ کہتے ہیں کہ جس طرح میں خود کہتا ہوں اور

PDF Compressor Free Version

خود ہی سنتا ہوں اسی طرح ہر شخص اپنی ہی کہتا ہے اور اپنی ہی سنتا ہے۔ اس طرح واقعات اور عمل میں غیریت نہیں رہتی۔ جو چیز کسی ایک کے لئے مثالی ہے وہی دوسرے کے لئے مثال بنتی ہے۔ اس میں کسی دوسرے کی شمولیت مثال نہیں بنتی۔ اس طرح یہ نظم ہمیں وجودی اکائی کی طرف لے چلتی ہے اور ہمیں مفاہیم کے ایسے اثرات تک پہنچاتی ہے جہاں ہم موجود کو ایک وجودی اکائی میں دیکھتے ہیں۔ اس طرح غیر محسوس طریقے سے یہ توجیہ ایقان کا حصہ بننے لگتی ہے اس لئے کہ وسیع تناظر میں ساری سمجھ اور تمام علم و بیان ایک ہی ہیں یا ایک جیسے ہیں۔ اسی بات کو دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ''گہرائی سے ایک آواز'' کثرت سے وحدت کی طرف بڑھتی ہوئی ایک آواز ہے جو وجودی اکائی سے نکلتی ہوئی وجودی اکائی ہی کی طرف لوٹتی ہے۔ آٹھ مصرعوں کی اس نظم میں وسیع تر مفاہیم اور موضوعات کو شامل کیا گیا ہے۔ تفہیم کا عمل وسیع ہوتا چلا جاتا ہے۔

یہاں کیا ہے؟ وہاں کیا تھا؟/ سوالوں کا یہ سادہ ڈھب
مرے بدلے ہوئے لہجے کو معنی دے نہیں سکتا
مری آواز اوپر آتے آتے/ مری آواز ہی رہتی نہیں ہے
سماعت ساحلوں کی مطمئن ہوتی نہیں ہے
میں خود کہتا ہوں خود سنتا ہوں/ وہ سنتا ہے خود اپنی کہانی

(گہرائی سے ایک آواز)

اسی مراقبے اور سکوت کی کیفیت میں ایک اور نظم ''واپسی'' کے تخلیقی بساط کا منظر نامہ ہمیں خاموشی، سکون اور واپسی کے ایک عمیق تر غائر اور موثر لمحہ وجدان کی طرف لے چلتا ہے۔ یہاں بھی واپسی کا عمل خاموشی کی پیداوار ہے اور اسی خاموشی نے بہت سارے سکوت کے پردوں کو توڑنے کی کوشش کی ہے۔

اسی خموشی میں/ عمر بھر کی سنی سنائی/ صداؤں کا احتساب کرلوں
یہی وہ لمحہ ہے/ جب رواں ساعتوں/ کو حکم قیام دے کر
پچاس برسوں کی ساری گم گشتہ/ آہٹوں کا حساب کرلوں
اسی بظاہر سکون کی مضمحل فضا میں/ غموں کی یورش کو زیر کر کے
میں ایک بار/ اپنے آپ کو فتح یاب کرلوں/ کہ رفتہ رفتہ
مری بند مٹھیوں سے یادیں سرک رہی ہیں
فضا میں تحلیل ہو رہی ہیں
دھواں دھواں ساعتوں میں اکثر/ وہ چند لمحے
ابھی تلک جگنوؤں کی صورت/ دکھا کے قندیل رہنمائی
حیات کے تاریک کراں میں بھی
شوق منزل ابھارتے ہیں/ مگر اب آگے سفر کے معنی؟

تھکن کے لمحوں میں
دھیرے دھیرے، میں واپسی کے سفر میں
گزری ہوئی فضاؤں/ میں سانس لوں گا
مسل کے قدموں سے/ وقت نے جن کو رکھ دیا ہے
انہیں گلابوں کی باس لوں گا

(واپسی)

نظم ''واپسی'' میں زندگی کے احتساب کی جو حالت قائم ہوتی ہے اور شاعر اپنے گزرے ہوئے تمام لمحوں، حسرتوں اور آرزوؤں کا حساب لینا چاہتا ہے اور مسائل کی تفہیم کی طرف کوئی قدم اٹھانا چاہتا ہے اور اس اقدام میں اس کے لئے جو چیز خوش آئند اور محبوب ہے وہ اپنی ذات کا مراقبہ ہے کہ اس کے بغیر یکسوئی کے ساتھ اپنے حال احوال کا بغائر مطالعہ نہیں کیا جاسکتا اور نہ کسی مطالعہ کی تمہید ہی سامنے آسکتی ہے۔

نظم ''واپسی'' دراصل ایک ایسی تخلیقی جست ہے جو وادیوں اور زمانوں کے تہہ در تہہ پردوں سے گزرتی ہوئی ایک ایسے ذوق اور پسند کی ہمسری اختیار کرتی ہے جو اس سے وقت کے اثرات کو زائل کرتی اور یک بہ یک شاعر کے اندر جذباتی گہرائی اور وسعت پیدا کرتی ہے۔ ایسے ہی مراقبے نے علیم اللہ حالی کو ماضی کی سرگذشت اور اس کے پیچیدہ مقامات سے آگاہ کیا ہے اور انہیں شعور اور جذبات کی میانہ روی کی طرف لے گیا ہے۔

اس موضوعاتی تعریف میں ان کی نظم ''امکان'' بھی پیش کی جاسکتی ہے جو ایسے ہی عمیق جذباتی اشاروں کی طرف دلیل بن گئی ہے جو اوپر بیان کئے گئے۔ اس نظم میں امکان، غیر ممکنہ تشکیلی عنوانات اور

PDF Compressor Free Version

ضوابط کے فروغ کا حصہ نہیں بلکہ یہاں امکان دراصل خود اپنی بازیافت کی ایک ایسی لامحدود کوشش ہے جس نے سوال کے اندر سوال اور جواب کے اندر جواب کی فضا تیار کر رکھی ہے۔ ایک کے اثر میں آ کر جب دوسرا اپنے پر پھیلاتا ہے تو اشاروں اور استعاروں کے ذریعہ ان کا تخلیقی عمل کسی اجنبی لہر کے سپرد ہونے کی بجائے اپنے آپ کو حسین و دلکش بنانے میں مصروف ہو جاتا ہے۔

چپ کی ندی اونگھ رہی ہے
یا پھر گویا میرا کمرہ
اندھی ساکت پاتالی گہرائی میں ہو
کمرہ ہے یا خاموشی کی جادو نگری
وقفوں کے بے آواز قدم میں
ہر شئے ڈوبی جاتی ہے
ایسے بھیانک سناٹے میں
کوئی آہٹ کوئی دستک؟
ناممکن ہے
لیکن ایسا بھی ہوتا ہے
آنے والا بے آہٹ بھی آ جاتا ہے

(امکان)

یہاں یہ نتیجہ ماخوذ ہونا طبعی ہے کہ حواس خمسہ سے بعید ادراک کی منازل ٹٹولتے ہوئے بھی ہم کوئی رنج نہیں اٹھاتے۔ یہ احساس اپنے وجود کی داخلی تلاش و جستجو ہے، اس لئے علیم اللہ حالی جب وقفوں کے بے آواز قدم میں تمام شئے کے ڈوبنے کی بات کرتے ہیں تو گویا وہ اپنے تمام احساسات اور عزائم کو کسی حصار میں چھوڑ آنا چاہتے ہیں اور اس کے بعد پھر ان احساسات و عزائم کی مدد سے امکانات کی نئی دیوار تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر زمانے کے ابدی، لامتناہی مرور کے آگے بے دست و پا ہے۔ وہ اپنے آپ میں بے حیثیت اور بے شناخت ہو گیا ہے اور یہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ وہ تمام معروضی اور موضوعی حقائق جو شاعر کو حواس کے ذریعہ معلوم ہیں وہ ان سب کو مٹاتا ہوا مرور زمانے کے پس پردہ کسی گم شدہ وجود اور کسی گم شدہ معانی کی تلاش میں مصروف ہے۔ شاعر کی یہ مصروفیت اسے اپنے وجود میں مرکوز کر دیتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ اسے اپنے وجود سے باہر کی دنیا کا علم عطا کرتی ہے، مگر مجموعی حیثیت سے وجود ذاتی کے اسرار و رموز اور خارجی وجود کا لامتناہی سلسلہ ایک دوسرے سے متصادم ہو کر حیرت و حسرت سے گزرتا ہوا شاعر کو شناخت کی تفہیم عطا کرتا ہے، پھر شاعر ہر منظر پر اور زندگی کے سمندر سے ابھرنے والے ہر احساس کو اپنے اندر سمیٹتا چلا جاتا ہے۔ زمانی مرور سے جب ہم اشیاء اور حقائق کا علم حاصل کرتے ہیں تو زندگی اور کائنات کے ساتھ ہمارا ایک داخلی توافق قائم ہو جاتا ہے۔ ہم اس توافق کو کوئی اور نام بھی دے سکتے ہیں، مگر یہ ضروری ہے کہ ایسے مفاہیم کی تلاش میں اپنے وجود کی ایک گونہ پہچان موجود ہو، مرور زمانہ کی لامتناہیت، ایک جانب تو لازمی طور پر تمام موجودات کو اسیر اور مسخر کئے ہوئے ہے، مگر اس قید اور تسخیر میں ہوتے ہوئے بھی انسانی وجود کا من حیث الکل جو تصور قائم ہوتا ہے وہ کائنات کی دوسری اشیا کے تصور سے بالکل جدا ہے۔

مرور زمانی کی لامتناہیت میں آپ کو گم کرنے کا ہنر علیم اللہ حالی کے یہاں موجود ہے، چنانچہ اس باب میں بھی ان کا تحیر اور بڑھتا چلا گیا ہے۔ مرور زمانہ کی جلوہ گری اور اس کے جمال نے ان کو صرف خاموشی کے ساتھ تماشا دیکھنے کا انداز عطا کیا ہے، اس لئے وہ زندگی کے تماشائی بن کر اس کے افہام و تفہیم کو دریافت کی مزید راہوں کی طرف لے گئے ہیں۔ ان کی جن نظموں نے اس مفہوم کو اختیار کیا ہے ان میں ''داستان''، ''سرِ شام''، ''یہ بھی سچ ہے وہ بھی سچ''، ''انت'' (آخری بند) اور ''پہلے جیسا'' کا ذکر نا گزیر ہے۔ ''داستان'' میں اظہار کی ہنرمندی واقعاتی تسلسل کو کسی ایک لمحہ میں منجمد کر دیتی ہے، پھر اس جمود سے آگے زمانے کے بہاؤ کی کوئی تعریف جاننا چاہتی ہے جسے ہزار ہا برس گزرنے کے بعد بھی جب کہ تمام آثار و خواص اپنی نشانی مٹا چکے ہوتے ہیں اور اس تصویر میں جب زمانہ وراء الزمانہ ہوتا چلا جاتا ہے ''اشیا'' کے ادراک کا کوئی واضح طریقہ، حوصلوں اور ارادوں سے پرے، وقت کی زبان سے بولتا ہوا، وقت کے آگے اپنے گمان اور اپنی منطق کو کسی وسیع تر مفروضے کے لئے مستقبل کے حوالے کر دیتا ہے، حالانکہ اس نظم میں

PDF Compressor Free Version

اکتساب کا علمی اور مدلل راستہ وہی ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ کسی آخری نشانے کو ہدف بنائے۔ اس نظم میں جو خیال گرفت میں آتا ہے وہ زمانے کی خود اپنی زمانی گردش پر دلیل بن جاتا ہے۔

''داستان'' میں ایک پرانے کھنڈر کو زمانے کی گزرگاہ کی نشانی قرار دیا ہے اور اس سے وابستگی کو عین زمانے کے مرکزی بلکہ واقعی نشانیوں کا اظہار سمجھا گیا ہے۔ نظم ''داستان'' میں اصل پوشیدہ نکتہ یہ ہے کہ یہاں صداؤں میں کوئی آواز ڈوب جاتی ہے اور صداؤں کے درمیان ڈوبنے والی آواز کہنہ عمارت کی کہن سالی کا مداوا معلوم ہوتی ہے، مگر پھر بھی اپنی دسترس سے دور ہے۔ شاعر کو اس آواز کی حقیقت مطلوب ہے اور وہ اس آواز میں پوشیدہ، بوسیدہ عمارت کی کہن سالی کا مداوا ڈھونڈنا چاہتا ہے۔

یہ طائر/ جو، ہر شام/ کہنہ عمارت کے ٹوٹے کنگورے
پہ تا دیر/ دن بھر کی سب داستاں کہتا رہتا ہے/ اور وہ عمارت
گئے گزرے لمحوں کی ساری مصیبت،
ہر اک پل میں مسمار کرتی ہوئی ریزشوں/ کی صعوبت کا غم
بھول کر/ ان صداؤں میں یوں ڈوب جاتی ہے
جیسے، یہ آواز ہی
اس کہن سالگی کا مداوا ہو
جیسے، یہی اس کی ساری شکستوں کا حاصل ہو
دیوار و در کے کھسکتے قدم
اپنے خالق سے/ اک شام کی بھیک اور مانگ کر
اُس کہانی کے انجام کو جاننا چاہتے ہیں
وہ کہانی/ جو بے بس پرندے کے اظہار سے
آج بھی دور ہے

(داستان)

اس طرح نظم ''داستان'' علیم اللہ حالی کی ان نظموں میں ممتاز شمار کی جائے گی جو ہمیں زمانے کی رفتار اور رنگ کی بساط پر تھرکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ''داستان'' دراصل ازل اور ابد کی داستان ہے جو شاعر کے علم میں تا دم تحریر معلق ہے۔ اس نظم میں حالی کی تخلیقی اور جمالیاتی فعالیت نے ایک زمانے کے تصور کو ایک نقطے پر اس طرح مرکوز کر دیا ہے کہ تمام اشیاء اور احوال، اثبات و نفی کا ہر دائرہ، اسی غیر محسوس نقطے کی طرف راجع ہے اور وہ اسی سے اپنی حس سادس کو متصل دیکھنا چاہتا ہے۔

اخیر میں ہم اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ علیم اللہ حالی کی شاعری اردو میں ایسی تعبیرات اور بیان کے ایسے بالیدہ اشاروں کو ترتیب دے رہی ہے جو حواس خمسہ کے اثر و رسوخ سے اوپر اٹھ کر حس سادس کی پروردہ معلوم ہوتی ہے۔ علیم اللہ حالی کی اس حس سادس کا فیضان ان کا اکتسابی عمل نہیں ہے بلکہ یہ صد فی صد ایک غیر اکتسابی اور وہبی عمل ہے جس کے ذریعہ شاعری کو اسرار و معانی حاصل ہوتے ہیں۔ علیم اللہ حالی پر اس حس سادس کا فیضان ہے کہ ان کی شاعری میں ایسے احوال و کوائف شامل ہیں جو اردو میں نئے طرز اور نئے وجدان کی وسیع تر اشاریت پیش کرتے ہیں۔ ایسی شاعری کا اطلاق ان احوال و مقامات سے ہے جو شاعری کے اسرار و معانی میں جمال کے متمنی ہیں۔ یہ وہ شاعری ہے جو انسانی باطن سے ایک محض ربط قائم کرتی ہے اور اسے اپنا اسیر بنا لیتی ہے۔ اس شاعری میں سارے کا سارا اعتبار صرف حرف و لفظ تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کی رسائی ایک ایسی نامعلوم حیران کر دینے والی حقیقت سے ہے جو اپنے بیان میں ہر شئے کی تعبیر تلاش کرتی ہے۔ یہ شاعری حس سادس کی شاعری ہے، اس لئے یہ ہمیں شاعری کی سرحد سے پرے شاعری کا عرفان عطا کرتی ہے۔

علیم اللہ حالی کی حس سادس کے اثر سے ان کے بیان میں ایک تحذیری کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ ہر نظم اور ہر تخلیق زندگی کا تحذیری رنگ اختیار کئے ہوئے ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے اعتدال کے ساتھ چلتے چلتے معاً کوئی خیال لپک کر سامنے آ جائے اور شاعر کا رخ کسی دوسری طرف موڑ دے۔ علیم اللہ حالی اردو میں ساٹھ کی دہائی کے شاعر ہیں جو نظم و غزل میں تیز روی کے ساتھ آگے بڑھے ہیں اور انہوں نے غیر معمولی القائی ذوق کی مدد سے اردو کے موجودہ دور کے نظم گو شعرا کی صف میں اپنی شاعری کے ذریعہ ایک اونچا حال و مقام حاصل کر لیا ہے۔

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

ڈاکٹر سید ارشد اسلم

Deptt. of Urdu, P.P.K. College, Bandu, Ranchi

اردو میں شعری و ادبی سرقہ

شاعری میں سرقوں کا راز انیسویں صدی کے شروع میں بے نقاب ہو گیا تھا اور مختلف رسائل و جرائد میں کثرت سے مضامین اور امثال کی اشاعت کے ذریعہ شعرا کی سرقہ بازی کو افشا کرنے کی روایت تیزی سے مقبول ہو رہی تھی۔ حکیم ابوالعلا ناطق لکھنوی کا مضمون ۱۹۳۰ء میں ''زمانہ کانپور'' میں شائع ہوا اس کے مطالعے سے اس دور میں سرقے سے متعلق غلغلے اور ہنگامے کا تھوڑا بہت اندازہ ہوتا ہے، لیکن یہ پتہ نہیں چل پاتا کہ اردو فارسی شاعری کا سب سے پہلا سارق کون تھا۔

اردو شاعری میں فارسی زبان و ادب سے طبعی مناسبت اور ادبیات فارسی کے گہرے اثرات موجود ہیں، اس لیے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو شاعری میں سرقے کی روایت سب سے پہلے ایران کے راستے سے ہندوستان میں داخل ہوئی اور ایران میں جس نے سب سے پہلے سرقہ کیا وہ شاید ''امیر معزی'' تھا جو سلطان سنجر کا ملک الشعرا تھا جس نے سیف الدولہ کے خیالات پہ متعلق ''قوس قزح'' کو بالکل اپنا بنا کر پیش کیا تھا، پھر تو رفتہ رفتہ اس طبقے میں یہ رسم عام ہو گئی۔ چونکہ اردو شاعری فارسی شاعری کے زیر اثر عالم وجود میں آئی اس لیے جب یہاں شعرا حشرات الارض کی طرح پیدا ہو گئے تو یہاں بھی یہ رسم وبا کی طرح عام ہو گئی۔ پہلے سرقہ کا طریقہ یہ تھا کہ غیر معروف اور گزشتہ لوگوں کے خیال کو اپنے الفاظ کا جامہ پہنا کر پیش کرتے تھے، پھر ایک زمانہ ایسا آیا کہ معاصرین کے خیالات و نتائج افکار کو جگہ جگہ اختصار و اضافہ کے بعد اپنا بنا کر پیش کیا جانے لگا چنانچہ میر انیس مرحوم کو یہ کہنا پڑا۔

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار
خبر کرو میرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

لیکن یہاں تک بھی غنیمت تھا کہ اس کا اثر صرف نظم کے اندر محدود رہتا تھا، ستم تو یہ ہوا کہ نثر بھی نہ بچی اور اس پر بھی قبضہ ہو گیا۔ اشعار میں سرقہ کی صورتیں کیا ہو سکتی ہیں، اس تعلق سے بتایا گیا ہے کہ:

> ''سرقہ یا اخذ یا نقل یا ترجمہ یا تقلید زیادہ تر ان اشعار میں ممکن و آسان ہے جن میں کوئی مضمون معمولی الفاظ میں نظم کر دیا گیا ہو، مضمون کے علاوہ انتقال کی دوسری صورت یہ ہے کہ مضمون سے مضمون پیدا کر لیا جائے اس کو اخذ کہتے ہیں۔ تیسری صورت یہ ہے کہ صرف تخیل شعری منتقل کر لی جائے۔ چوتھی صورت یہ ہے کہ انداز بیان لے لیا جائے، پانچویں صورت یہ ہے کہ اسلوب نظم سے ایک خاص رخ جس شعر میں پیدا ہو کر شعر کو پر کیف و پر لطف بنا دے، وہ رخ لے لیا جائے، چھٹی صورت یہ ہے کہ لفظ بہ لفظ ترجمہ کر لیا جائے، ساتویں صورت یہ ہے کہ شعرا کے اجزائے معنوی و لفظی سے کوئی جزو منتقل کر لیا جائے اور باقی اجزاء خود اضافہ کر کے شعر مکمل اور جس قسم کی تشبیہ یا استعارے سے شعر میں محاکات یا ندرت پیدا ہو جائے اس قسم کی چیز لے کر اسی طرح کی لطافت شعر میں پیدا کر دی جائے۔'' (۱)

فارسی شعرا کے اشعار سے مضامین لے کر انہیں اردو میں ترجمہ کرنا متقدمین کا دل پسند مشغلہ تھا۔ اس مشغلہ کی کچھ جھلکیاں منیر لکھنوی نے ''منیر البیان فی تحقیق اللسان'' میں جمع کر دی ہیں۔ ان امثال کو توافق، توارد، استفادہ، اخذ، ترجمہ وغیرہ نہیں کہا جا سکتا، یہ سراسر سرقہ ہے۔ ان اشعار کی تعداد انیس ہے منیر لکھنوی نے، میر جلیل بلگرامی، ذوق، ناسخ، سودا، فغاں کے اشعار نقل کیے ہیں جو اشرف، ناصر علی بیدل، جلال،

PDF Compressor Free Version

خسرو، سعدی سلیم، غنی، قدسی وغیرہ کا چربہ ہیں۔ اس سلسلے میں ناطق لکھنوی لکھتے ہیں کہ:

"جہاں تک فارسی شعرا کی تقلید کی بات ہے تو ناسخ و غالب دونوں یہ چاہتے تھے کہ فارسی کی روح کو اردو قالب میں ڈھالیں، چنانچہ غالب کے اردو دیوان میں بکثرت ایسے اشعار ہیں، جن میں فارسی اشعار سے مضامین لئے گئے ہیں اور جس شعر کا کوئی حصہ ہندوستان کے مذاق سے علیحدہ ہے اس حصہ کو بدل دیا گیا ہے۔ اس ردوبدل نے غالب کی اردو شاعری میں اردو کی ادبیت کے لحاظ سے ایک بدرنگی پیدا کر دی ہے اور صدہا شعرا ایسے ہیں جن میں خیال و تخیل تو بہت بلند و نازک ہے، مگر کیفیت شعری سے معریٰ ہیں۔ اس عیب کو غالب نے خود بھی محسوس کیا ہے۔" (۳)

شعرائے اردو میں فارسی زبان سے طبعی مناسبت اور ادبیات فارسی کا گہرا مطالعہ مرزا غالب کی طرح شاید ہی کسی دوسرے کا تھا۔ ہندیوں میں بیدل اور ایرانیوں میں نظیری اور ظہوری وغیرہ کا رنگ ان کے کلام میں صاف طور پر جھلکتا ہے اور ان کے یہاں ایسے متعدد اشعار پائے جاتے ہیں جو کلیتاً یا کسی حد تک فارسی اشعار سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں۔ امیر خسرو نے محمد سلطان بن غیاث الدین بلبن کے شہید ہونے پر جو مرثیہ لکھا تھا اور جو ان کی شہرت کا پہلا سبب ہوا، اس میں ایک شعر یہ ہے۔

بسکہ آب چشم خلقی شد روان دو چار سو
پنج آبی دیگر اندر ملتان آمد پدید

اس شعر کو ناسخ کہتے ہیں۔

ایک تربتی ہے دو آنکھیں مری
اب الہ آباد بھی پنجاب ہے

(بیدل)

مسی آلودہ برلب رنگ پان است
تماشا کن نہ آتش دخان است

(ناسخ)

مسی آلودہ لب پر رنگ پان ہے
تماشا ہے نہ آتش دھواں ہے

(ناصر علی)

بوریا جای من و جای تو نگر قالین
شیر قالین دگر و شیر نیستاں دگر است

(ناسخ)

فرق ہے شاہ و گدا میں قول شاعر ہے یہی
شیر قالیں اور ہے شیر نیستاں اور ہے

مضمون کی چوری ہمارے اساتذہ کی ایک پرانی عادت ہے۔ غالب، حسرت، اصغر، میر، اسیر، سراج، جگر کے اشعار اس سلسلے میں پیش کیے جاتے ہیں۔ میر کے اس شعر کو۔

کہو قاصد جو وہ پوچھے ہمیں کیا کرتے ہیں
جان و ایمان و محبت کی دعا کرتے ہیں

اسیر نے اس طرح مسخ کیا۔

جو وہ پوچھے ہمیں کیا کرتے ہیں
کہو قاصد کہ دعا کرتے ہیں

یا میر کے اس شعر کو۔

اے بتو اس قدر جفا ہم پر
عاقبت بندۂ خدا ہیں ہم

شیریں (بیگم صاحبہ بھوپال) نے اس طرح اپنا بنا لیا۔

نہ کرو اتنی ہم پر جور و جفا
اے بتو بندہ خدا ہیں ہم

میر کا ایک مشہور شعر۔

"یہ کہتے وہ کہتے ہم" یہ کہتے جو یار آتا
سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

دراصل خسرو کا یہ شعر ہے۔

بدل گویم کہ اینہا خواہش گفت
چو او پیش نظر آید زبان کو

سراج دکنی فرماتے ہیں۔

PDF Compressor Free Version

پی بن مجھ انسوؤں کے شراروں کی کیا کمی
جس رات چاند نہیں ہے ستاروں کی کیا کمی

دراصل یہ مضمون قاسم کا زادہ طبیعت کا ہے۔

بروزِ ہجر مرا دیدہ بس گہر بار است
شبے کہ ماہ نباشد ستارہ بسیار است

انعام اللہ خاں یقین کا ایک شعر ہے۔

کیا بدن ہوگا کہ جس کے کھولتے جامے کے بند
برگ گل کی طرح ہر ناخن معطر ہو گیا

یہ شعر دراصل اس طرح ہے۔

ناخن تمام گشت معطر چو برگ گل
بند قبائے کیست کہ وا میکنیم ما

اب کچھ سرقات حسرت دیکھئے۔

مل چکی ہم کو ان سے داد وفا
جو نہیں جانتے لگی دل کی

(حسرت)

ہم کو ان سے ہے وفا کی امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

(غالب)

کافی تھی مجھے دُردِ تہہ جام بھی حسرت
کاسہ جو مرا مے سے وہ لبریز نہ کرتے

(حسرت)

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہہ جام بہت ہے

(غالب)

مل گیا اچھا سہارا عذر ہستی کا ہمیں
لے لیا آغوش میں اس گل کو بے باکانہ آج

(حسرت)

ہم سے کھل جاؤ بوقت مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

(غالب)

مانا کہ یقینی ہے اثر جذبہ دل کا
کیا ہوگا مگر، ہجر میں تائید اثر تک

(حسرت)

آہ کو چاہیے، اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

(غالب)

اسی طرح سرقات اصغر گونڈوی دیکھئے۔

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا
جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے

(اصغر)

خواب دیدم کہ ترا دست بدامن زدہ ام
در گریبانِ خودم بود چو بیدار شدم

(ملک قمی)

ہے تلوں سے ترے جلوہ نیرنگ حیات
میں تو مر جاؤں جو امید وفا ہو جائے

(اصغر)

اب تو غالب کا یہ شعر آپ کو خود ہی یاد آ گیا ہوگا۔

ترے وعدہ پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

فارسی اور اردو کا یہ دو مصرع بہت مشہور ہے۔

خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید
خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہے

فانی کے سرقات کی مثالیں بھی دیدنی ہیں۔

دل ہی نگاہ ناز کا ایک اد اشناس تھا
جلوہ برق طور نے طور کو کیوں جلا دیا

(فانی)

گرتی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

(غالب)

PDF Compressor Free Version

آتے ہیں عیادت کو تو کرتے ہیں نصیحت
احباب سے غم خوار ہوا بھی نہیں جاتا
(فانی)

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا
(غالب)

جتنے غم چاہے دیے جا مجھے یارب لیکن
ہر نئے غم کے لیے تازہ جگر پیدا کر
(فانی)

میری قسمت میں غم اگر اتنا تھا
دل بھی یارب کئی دیے ہوتے
(غالب)

نہیں یہ مردنِ دشوار بے سبب یعنی
یقین وعدہ پیغام بر نہیں ہے مجھے
(فانی)

ترے وعدے پر جئے ہم تو جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
(غالب)

حقیقت یہ ہے کہ مشاہیر اردو کے کلام میں سرقات کی مثالیں عام طور پر مشہود ہیں اور اتنی کثرت سے ہیں کہ ان کا تھوڑا سا انتخاب بھی ایک کتاب کی صورت لے سکتا ہے، بہر حال اب جگر کے سرقات دیکھئے ۔

اس تبسم کے تصدق ، اس تجاہل کے نثار
خود مجھی سے پوچھتے ہیں کون یہ دیوانہ ہے
(جگر)

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا
(غالب)

تصویر امیدوں کی آئینہ ملالوں کا
انساں جسے کہتے ہیں محشر ہے خیالوں کا
(جگر)

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو
(غالب)

سر رکھ ہی دیا سنگ درِ یار پہ میں نے
اب حشر بھی اٹھے تو مجھے کچھ نہ خبر ہو
(جگر)

اس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسد
اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو
(غالب)

مثالیں بہت ساری ہیں، بلاشبہ اردو شاعری میں سرقے کی روایت بہت پرانی ہے اور اس کی بنیاد بھی ہمارے اساتذہ کی ڈالی ہوئی ہے۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی اردو شاعری فارسی کے غلبے سے آزاد ہونے لگی اور انگڑائی لے کر اپنی ادائیں دکھانے لگی، لیکن بنیادی طور پر اس کا سانچہ اور ڈھانچہ فارسی سے مستعار تھا، لہٰذا سرقے کی روایت جو فارسی میں بہت مستحکم تھی جیسا کہ کہا گیا اردو شاعری اور شعرا کے مزاج میں خود بخود دخیل ہوگئی اور کہنا چاہئے کچھ عجیب انداز و ادا سے دخیل ہوئی، یہاں تک کہ شعری سرقوں اور توارد پر نجم الغنی نے "بحر الفصاحت" میں تفصیل سے روشنی ڈالی اور ان مباحث پر بعد میں قلم اٹھانے والوں نے "بحر الفصاحت" سے بھرپور استفادہ بھی کیا۔

سرقہ نگاروں اور سرقہ بازوں کے خلاف "الناظر" نے ۱۹۱۹ء میں آل انڈیا احتساب کانفرنس کے ذریعہ پہلی مرتبہ منظم جدوجہد کا آغاز کیا اور ۱۹۵۶ء میں ماہنامہ "مہر نیم روز" نے اسے "جہاد مسلسل" کا رنگ عطا کیا۔ "مہر نیم روز" کا یہ تاریخی سلسلہ اگرچہ علم و ادب کے صنم خانے میں تکبیر بن کر گونجتا رہا، مگر یہ تکبیر صحرا کی اذان بن گئی اور آخر کار ۱۹۷۷ء میں یہ اذان بھی ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی علمی، ادبی اور تحقیقی سرقوں کی فصل بہار برعظیم ہندو پاک میں لہلہا اٹھی۔

بیسویں صدی کا یہ بڑا المیہ ہے کہ عظیم ترین سرقے کا ارتکاب جو اردو کے بڑے اکابرین کے ذریعہ شروع ہوا تھا آج بھی جاری و ساری ہے۔ ایسے المیے جامعات میں کثرت سے ہو رہے ہیں۔

PDF Compressor Free Version

کیا ان المیوں کا یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہے گا یا اس پر پابندی لگائی جاسکتی ہے؟ محققین کے مسودات کو چوری کرکے اپنے نام سے شائع کرلینا، دوسرے محققین کی عسرت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اونے پونے داموں پر مسودات خرید لینا، عقیدت مندوں کی طرح حاضر خدمت ہوکر کسی موضوع کو چھیڑنا اور گفتگو کے دوران بکھرنے والے لولوئے لالہ کو سمیٹ کر مقالہ تیار کرنا، مختلف ناشرین اور اداروں کے پاس طباعت کے لئے آنے والے مسودوں کا مطالعہ کرکے اسی موضوع پر کتاب اصل کی طباعت سے پہلے ہی اپنی کتاب شائع کرالینا، قینچی کے ذریعہ تحقیق کی صورت میں جسے عرف عام میں Cutting, Pasting کہتے ہیں، کتابیں اور مضامین تیار کرلینا، اہم کتابوں کے مضامین و دلائل لفظ بہ لفظ نقل کرلینا وغیرہ وغیرہ۔ سرقے کے اتنے اقسام ہیں کہ اگر بیان کئے جائیں تو باقاعدہ اس موضوع پر کتاب لکھی جاسکتی ہے۔

سرقے کی ایک قسم ترجمے کی بھی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کسی زبان کی کوئی کارآمد چیز اردو میں منتقل نہ کی جائے بلکہ شاید ایک زبان سے دوسری زبان میں کسی ایسی چیز کو منتقل کرنا اور کامیابی کے ساتھ منتقل کرنا بہت بڑا کارنامہ ہے اور زندہ قوموں کے افراد ایسے کارنامے ہمیشہ انجام دیتے رہتے ہیں، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں کے ذہن میں تصنیف، تالیف اور ترجمے کے غلط تصورات نے جڑ پکڑ لی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ تصنیف کا درجہ برتر ہے اور تالیف کا کمتر اور شاید ترجمے کا کوئی درجہ ہی سرے سے نہیں ہے، حالانکہ علم وفن کی دنیا میں اپنی اپنی جگہ ان میں سے ہر ایک کا درجہ بلند ہے اور یہی سبب ہے کہ وہ ترجمے کی نسبت اپنی طرف کرتے ہوئے کتراتے ہیں اور اسے اپنی کسر شان سمجھتے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ وہ اگر کسی دوسری زبان کی کوئی چیز اپنی زبان میں منتقل کر بھی لیتے ہیں تو اصل مصنف کا احسان ماننا تو دور کی بات ہے، وہ اس نام کی بھنک تک کانوں میں پڑنے نہیں دیتے بلکہ وہاں بھی ان کا تقاضہ یہی رہتا ہے کہ اسے تم خاص ہماری اپنی تحقیق سمجھو۔ ظاہر ہے یہ بڑا ظلم ہے اور اس ظلم کی وسعت دور دور تک پہنچتی ہے۔

اس دور جدید میں نفسیاتی تجزیے کی راہ آسان ہوگئی ہے۔ جس طرح شعرا کے اشعار سے ان کی تحلیل نفسی ممکن ہے، غالباً کتابوں کو سامنے رکھ کر ان کے مصنفین و مولفین و مترجمین کی بھی تحلیل نفسی کی جاسکتی ہے۔ آخر کیا سبب ہے کہ ایک شخص کسی دوسرے کی محنت پر یوں ڈاکہ ڈالتا ہے کہ بے تکلفی کے ساتھ اسے اپنے نام سے پیش کر دیتا ہے۔ نفسیات کی روشنی میں آخر ذہن و دماغ کی وہ کون کون سی ترغیبات ہیں جس کی ورغلاہٹ پر آدمی ایسی حرکتیں کر جاتا ہے جو بظاہر تو معمولی ہیں، مگر اس کے اثرات سنگین ہو سکتے ہیں۔ کیا عارضی و سطحی مسرتوں کا شوق؟ تن آسانی؟ خود بینی و خود نمائی؟ پامالی اخلاق کا میلان؟ خود غرضی و سنگدلی یا کچھ اور؟ مگر ان میں تو ہر بات وہ ہے کہ اگر اس کا سلسلہ یوں ہی بڑھتا رہا تو آگے مجرمیت کی سرحد کچھ بہت دور نہیں رہ جاتی۔ بہر حال اس پر تو روشنی کوئی ماہر نفسیات ہی ڈال سکتا ہے، لیکن یہ سیدھی سادی بات تو ہم آپ بھی جانتے اور سمجھتے ہیں کہ کسی دوسرے کی چیز پر قبضہ جمالینا اور اسے اپنی ملکیت قرار دے لینا اور ایک طرح سے لوگوں کو غلط فہمی اور فریب میں ڈال رکھنا، بہر طور قابل اعتراض اور بہر لحاظ قابل گرفت ہے اور کچھ اسی قسم کی صورتیں درپیش ہوئی ہوں گی جن کے انسداد کے لئے پہلے پہل کاپی رائٹ کا قانون وجود میں لایا گیا ہوگا بلکہ کاپی رائٹ ہی پر کیا موقوف دنیا کے ہر قانون کا جائزہ لے لیجئے، زندگی کے مختلف شعبوں پر نظر ڈالئے پھر دیکھئے کہ اس کے وجود میں آنے یا لانے کی ضرورت کس طرح پیش آئی ہوگی۔ آج بھی ضرورت ہے کہ ادبی سرقے کے رجحان پر مختلف جہتوں سے تجزیاتی نگاہ ڈالی جائے۔

حواشی

(۱) ناطق لکھنوی، سرقہ یا توارد، ص ۱۵۸

(۲) منیر لکھنوی "منیر البیان تحقیق اللسان" ص ۹۷ تا ص ۹۹، مطبع مجیدی کانپور، بار اول جنوری ۱۹۳۰ء

(۳) بگزار از مجموعہ اردو کہ بیرنگ من است' ناطق لکھنوی، سرقہ و توارد، زمانہ کانپور، ص ۵۹

❁❁❁

☆ آزادی ملک وقوم کی دائمی جوانی کا نام ہے
☆ اخلاق جسمانی حسن کی کمی پوری کر دیتا ہے
☆ آنکھ والا وہ ہے جو اپنے آپ کو دیکھے

PDF Compressor Free Version

افسانے

نورالحسنین

1-12-31, Pragati Colony, Ghati, Aurangabad 431001

بیچ بھنور ندیا گہری

اُنہوں نے اخبار کی سرخی پڑھنے کے بعد پوری خبر کو پڑھنا بھی ضروری نہیں سمجھا اور اُسے غصے سے کتابوں کے ریکٹ کی طرف اُچھال دیا اور سوچنے لگے، حد ہوگئی اب تو ایسا لگتا ہے مسلمانوں سے اُن کا اللہ بالکل ہی روٹھ گیا ہے اور اُنہیں آر ایس ایس کے حوالے کر کے بے فکر ہوگیا ہے۔ ٹھیک اُسی وقت اُن کا بیٹا کرکٹ کا کٹ بیگ پیٹھ پر لادے صورت لٹکائے داخل ہوا اور اُنہوں نے بے تابی سے پوچھا:

''کیا ہوا فرحان ؟''

بیٹے نے پیٹھ پر سے کٹ بیگ کو اُتارتے ہوئے جواب دیا:

''کالج کی کرکٹ ٹیم فائنل ہوگئی اور اُس کا سلیکشن نہیں ہوا۔''

اُنہوں نے بیٹے کے مایوس چہرے کی طرف دیکھا۔

''بابا مجھ سے کمزور کھلاڑی ونود پانڈے کو ٹیم میں شامل کرلیا گیا، لیکن مجھے.....''

وہ کیا کچھ کہتا رہا، اُس کی آواز اُن کے کانوں تک نہیں پہنچی، البتہ اُن کا ذہن سوچ رہا تھا، اس ملک میں اب مسلمانوں کا مستقبل کیا ہوگا؟ ہر جگہ تعصب، ہر جگہ ایک ہی ذہنیت، کالج کی ٹیم کا سلیکشن اُن کے بیٹے کو ٹیشل کھلاڑی تو نہیں بنا دیتا؟ تعصب کرنا ہی ہے تو وہاں، اُس سطح پر کرتے، لیکن نہیں وہ تو ہر آغاز ہی سے مسلمانوں کو بے دخل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھے اور اسکول کی جانب روانہ ہوگئے۔

وہ ایک سرکاری اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے اور ریاضی کے نہایت قابل اُستاد مانے جاتے تھے۔ دیگر اساتذہ کی طرح اگر وہ چاہتے تو ٹیوشن کلاس شروع کر کے ہزاروں روپیہ کما سکتے تھے، لیکن اُنہوں نے کبھی یہ کام نہیں کیا، بلکہ اگر کسی طالب علم نے یہ خواہش بھی کی تو اُن کا جواب تھا، "Your teacher is not for sale" وہ چوبیس گھنٹوں کے اُستاد تھے۔ اُن کے پاس ذات، جماعت کی کوئی تفریق نہیں تھی۔ جن بچوں کو کلاس میں ریاضی کا کوئی مسئلہ سمجھ میں نہیں آتا وہ بے دھڑک اُن کے گھر چلے آتے اور وہ اُنہیں اس قدر اپنائیت اور خلوص سے گھنٹوں پڑھاتے کہ کبھی کبھی تو اُن کی بیوی بھی ناراض ہوجاتی کہ یہ گھر ہے یا اسکول؟ لیکن اُن کے رویئے میں کبھی تبدیلی نہیں آئی، یہی وجہ تھی کہ اُن کی بڑی عزت تھی اور اُن کے شاگرد اُن پر جان چھڑکتے تھے۔

''جناب اقبال صاحب.....!''

اُنہوں نے پلٹ کر دیکھا، مؤذن صاحب کے ہاتھوں میں اخبار تھا۔ ''اب تو گوشت کھانے پر بھی پابندی عائد ہوگئی ہے۔ عدالت کا فیصلہ بھی آگیا ہے؟''

اقبال سر کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ ''تو چھوڑ دیجیے اُسے کھانا.....'' اور پھر وہ بناء کے تیز تیز قدموں سے اسکول کے بڑے دروازے میں داخل ہوگئے اور مؤذن صاحب اُنہیں دیکھتے رہ گئے۔

آفیس کی دیوار سے لگ کر کچھ اساتذہ معروف گفتگو تھے۔ اُنہیں دیکھتے ہی وہ سب ایک لمحے کے لیے چپ ہوگئے، لیکن سب کے ہاتھ سلام کے لیے بلند ہوئے، اُنہوں نے سر کے اشارے سے جواب دیا اور آفیس میں داخل ہوگئے۔

''لگتا ہے صاحب نے آج کا اخبار نہیں دیکھا۔'' رحمت صاحب نے سب کی جانب دیکھا۔

''آپ لوگ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ اسکول میں، اسکول سے ہٹ کر کوئی بات نہیں کرتے۔'' پرشانت سر نے آہستہ سے کہا۔

''ارے سر! یہ سب دکھاوا ہے، حکام کی چاپلوسی ہے۔'' فیروز سر نے برا سا منہ بنایا۔

PDF Compressor Free Version

''ورنہ ہیڈ ماسٹری پر میرا حق تھا۔''

آوازیں اقبال سر کے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھیں۔

''بھئی ہمیں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

عرفان سر نے اپنے ٹیچنگ ایڈس کو سنبھالتے ہوئے کہا:

''ہیڈ ماسٹر خواہ کوئی رہے ہمیں تو بچوں کو پڑھانا ہے۔ اب رہا آپ کی اصل گفتگو کا مدعا کہ گوشت بند ہو گیا تو کیا کھائیں گے؟ تو صاحب بندہ سبزی ترکاری سے بھی اپنا کام چلا سکتا ہے۔''

رحمت سر نے عرفان سر کی جانب گھور کر دیکھا۔

''یہاں بات کھانے کی نہیں ہو رہی ہے، بلکہ ذہنیت کی ہو رہی ہے کہ اب تو عقیدت بھی قانون سے بالاتر ہو گئی ہے۔''

سب کی نظریں پرشانت سر پر جم گئیں اور پرشانت سر نے اویناش صاحب کی جانب دیکھا، ابھی نظریں کچھ کہہ بھی نہیں پائی تھیں کہ ٹھیک اسی وقت چپراسی نے گھنٹی بجانا شروع کیا اور ڈریل ماسٹر کی سیٹیاں شروع ہو گئیں اور اسکول کے تمام بچے نظم خوانی کے لیے اپنی اپنی قطاروں میں کھڑے ہو گئے۔

ریاست کا یہ ایک ایسا ضلع تھا جس میں تعلیمی سرگرمیاں سب سے زیادہ تھیں۔ جگہ جگہ خانگی اسکول بھی تھے، لیکن یہ شہر کا واحد اسکول تھا جہاں بیک وقت اردو اور مرہٹی میڈیم کے طلبا ایک ہی عمارت میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ یہاں پانچویں جماعت سے میٹرک تک کی تعلیم کا انتظام تھا اور سرکاری اسکول ہونے کے باجود یہ اپنی عمدہ تعلیم کے لئے شہرت رکھتا تھا، جس کا سارا کریڈیٹ اقبال صاحب کے سر بندھتا تھا۔ مرہٹی زبان پر بھی انہیں پوری طرح عبور حاصل تھا۔

ریاضی کا پریڈ لینے جونہی وہ کلاس میں پہنچے تو معمول کے مطابق سارے لڑکے اُن کے استقبال کے لیے کھڑے ہو گئے تھے، لیکن اُنہوں نے دیکھا مقامی ودھانک کا لڑکا سبھاش کھڑا نہیں ہوا تھا بلکہ وہ نیچے جھکا ہوا تھا گویا اُن کی نظروں سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اقبال سر کا ماتھا ٹھنکا۔ اخبار کی سرخی، فرحان کا ٹیم میں انتخاب نہ ہونا، فیروز صاحب کا طنز اور سبھاش کی حرکت، واقعی ملک میں حالات تیزی سے بدل رہے ہیں اور یہ لیڈر اپنے بچوں کو بھی زہریلا بنا رہے ہیں۔ غصے کی گرمی اُن کے دماغ میں چڑھنے لگی تھی اور اسی عالم میں اُنہوں نے بچوں کے ہوم ورک کی کاپیاں چیک کرنا شروع کیا۔ جماعت میں سناٹا چھایا ہوا تھا کیونکہ آج اقبال سر کے چہرے پر شگفتگی نام کو نہیں تھی۔ باری جب سبھاش کی آئی تو وہ اُسی طرح اپنی جگہ پر کھڑا تھا۔ اُنہوں نے اُس کی جانب غصے سے دیکھا، لیکن وہ اُن کے ٹیبل تک نہیں پہنچا۔ وہ زور سے گرجے:

''کیا تمہارا ہوم ورک چیک کرنے کے لیے مجھے تمہارے پاس آنا پڑے گا؟''

سبھاش نے گھبرائی ہوئی نظروں سے اُن کی طرف دیکھا۔

''کیا سمجھتے ہو تم؟'' وہ غصے میں کہے جا رہے تھے۔

''تم ہو گے کسی ایم ایل اے کے بیٹے، لیکن میں کوئی چاپلوس نہیں ہوں، یہاں تک اپنی صلاحیتوں پر پہونچا ہوں۔ کہاں ہے تمہاری ہوم ورک کی نوٹ بک.....؟''

''سر..... سبھاش نے ہوم ورک نہیں لایا ہے؟'' بازو میں بیٹھے ہوئے لڑکے نے ادب سے کہا۔

''اوہ..... تو بنا ہوم ورک کیے بھی یہ ٹھاٹھ ہیں تمہارے.....''

اقبال سر کا پارہ اور بھی چڑھ گیا اور وہ دانت پیستے ہوئے دہاڑے: ''بینچ پر کھڑے ہو جاؤ۔''

سبھاش بینچ پر کھڑا ہو گیا۔ وہ کلاس کا ایک ہونہار طالب علم تھا۔ یہ بے عزتی اُس سے برداشت نہیں ہوئی اور اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اقبال سر نے ایک بار پھر اُس کی طرف غصیلی نظروں سے دیکھا اور پھر بلیک بورڈ پر سوال لکھنا شروع کیا ہی تھا کہ چپراسی کلاس کے دروازے کے قریب پہنچا اور آہستہ سے کچھ کہا، اور وہ فوراً کلاس سے باہر نکلے، جونہی آفیس کے دروازے کے قریب پہنچے تو اُن کے سامنے اودھانک جی موجود تھے۔ اُنہوں نے سلام کے لیے جونہی اپنا ہاتھ اُٹھایا، اودھانک جی نے آگے بڑھ کر اُن کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

''یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ آپ گرو جی ہیں۔ آپ کا آدر کرنا ہمارا کرتویہ ہے۔''

اُنہوں نے بڑی محبت کے ساتھ اُنھیں اُن کی کرسی پر بٹھایا اور اس سے پہلے کہ اقبال سر کوئی سوال کرتے اُنھوں نے کہنا شروع کیا:

PDF Compressor Free Version

''بات یہ ہے گروجی کہ کل سبھاش کو بہت بخار چڑھا تھا، اب بھی اُسے بخار ہے۔ اُس کی ممی نے اُسے روکنا چاہا تھا، لیکن وہ رُکا نہیں، آپ کے درشن کی آپ کے دیوانے ہیں، آپ کے بنا ایک دن بھی نہیں رہ سکتے۔''

اقبال سر کے چہرے پر مسکراہٹ تھی، لیکن وہ اپنے آپ میں ایک عجیب سی پشیمانی محسوس کر رہے تھے۔ اُنہیں رہ رہ کر اپنے آج کے رویئے پر ندامت سی ہو رہی تھی، سبھاش کا آنسو بھرا چہرہ بار بار اُن کی آنکھوں میں گھوم رہا تھا۔

''سر اگر آپ اُسے اپنے ساتھ لے جانا چاہیں تو میں اُسے.....''

''نہیں نہیں.....'' اودھانک جی نے اقبال سر کو جملہ بھی پورا کرنے نہیں دیا:

''مجھے تو پارٹی کی میٹنگ میں جانا تھا، لیکن اُس کی ممی نے مجھے یہاں بھیجا ہے، یہ کہنے کے لیے کہ بخار کے کارن، وہ اپنا ہوم ورک بھی نہیں کر سکا، کہیں ایسا نہ ہو کہ اُسے لاپرواہ جان کر اُس کے انٹرنل مارکس کٹ جائیں۔''

''سر اپنے بیٹے کے تعلیمی کریئر میں آپ کی بیداری قابل تعریف ہے۔'' بے ساختہ اقبال سر کی زبان سے نکلا۔

''کاش یہ بیداری ہر ماں باپ میں پیدا ہو جائے تو ہمارے ملک میں ایک انقلاب آجائے گا۔''

''ہم کیا انقلاب لائیں گے گروجی؟ وہ تو آپ جیسے نشٹھاوان گرو ہی لا سکتے ہیں، اس دیش کی راج نیتی دیش کو کہاں لے جا رہی ہے؟ اس پر کسی کا دھیان ہی نہیں ہے۔ جاتی واد، جھوٹ، بھرشٹا چار، آستھا کے نام پر نیالائے منھ چڑھا رہے ہیں، شکشا کے نام پر کمائی کی دکانیں کھلی ہوئی ہیں، دنگے، پکشپات، اس دیش کی سبھیتا اور سنسکرتی کو دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں۔'' اودھانک جی کی گردن جھک گئی۔

''گروجی میں بھی اسی راج نیتی کا ایک بھاگ ہوں، کبھی سیدھی راہ پر چلنے کا دھیان بھی آیا تو پارٹی کا ایجنڈا زبان بند کر دیتا ہے۔'' اُنہوں نے اقبال سر کی جانب دیکھا۔

''آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں آج یہ کیسی باتیں کر رہا ہوں، تو گروجی اس ودیا مندر کا پوتر داتا ورن برے سے برے انسان کو بھی سچ بولنے پر مجبور کرتا ہے۔ آپ اور آپ کا یہ اسکول دونوں جاتی میں انسان پیدا کرنے کا کرتو یہ نبھا رہے ہیں، میں پھر کہتا ہوں، دیش میں یہ پریورتن لانے کی اِچھا اور ساہس اب کسی لیڈر میں نہیں ہے، کوئی لا سکتا ہے تو کیول آپ جیسے گرو ہی لا سکتے ہیں۔'' وہ اپنی جگہ سے اُٹھے۔

''ہم لوگ تو مایا موہ اور ستہ کے بھکاری بن گئے ہیں۔''

ایک نظر اُنہوں نے دیواروں پر آویزاں پیش رو لیڈروں کی تصویروں کی جانب دیکھا اور پھر وہ تیزی سے باہر نکل گئے۔

اُس دن کے بعد سے اقبال سر ایک عجیب سے تذبذب میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اپنے اسکول کو وہ جب بھی دیکھتے اُن کے دل میں بار بار یہ خیال آتا کہ یہ صرف نصابی علوم کے تکمیل کی جگہ نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا مقام ہے جہاں سے صرف کلرکوں، اور فیکٹریوں میں کام کرنے والے ورکروں کو پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ انسانوں کو پیدا کرنا ہے، احساس ذمہ داری، ایمانداری، رواداری، فراخدلی کے ساتھ ہی ساتھ ہر قسم کے ذہنی تعصب سے پاک و صاف محبِّ وطن پیدا کرنا ہے، لیکن اخبار اور ٹیلی ویژن کی خبریں دیکھ کر وہ اُداس بھی ہو جاتے اور اُن کی آنکھوں کے سامنے مسلمانوں کی زبوں حالی کی تصویریں گردش کرنے لگتیں، دن بدن زوال کی جانب جھکتی ہوئی قوم، اُجاڑ ہوتی ہوئی ڈیوڑھیاں، جھونپڑ پٹیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد، بے روزگار نوجوان، معاشی بدحالیاں اور غلط راستوں کی طرف بڑھتے ہوئے رجحان.....اور پھر وہی ایک سوال اُن کے ذہن پر کچوکے لگاتا، اس ملک میں مسلمانوں کا مستقبل کیا ہوگا۔

اقبال سر بہت زیادہ مذہبی انسان نہیں تھے، لیکن پھر بھی اُن کی صبح کا آغاز فجر کی نماز سے ہوتا اور وہ گھر سے اُس وقت تک باہر نہیں نکلتے تھے جب تک سورۃ یٰسین کی تلاوت نہیں کر لیتے۔ داڑھی اُنھوں نے کبھی نہیں رکھی، مزاج میں بڑی نفاست تھی، سوٹ اُن کا پسندیدہ لباس تھا، لیکن ٹائی کا استعمال نہیں کرتے تھے۔ مغرب اور عشاء کی نماز باقاعدگی سے اپنے محلے کی مسجد میں ادا کرتے تھے۔

ایسے ہی ایک رات وہ نماز عشاء کی ادائیگی کے بعد مسجد سے

PDF Compressor Free Version

باہر نکلنا ہی چاہتے تھے کہ کچھ لوگوں نے اُنھیں گھیر لیا۔

''صاحب دیوان ڈیوڑھی کے ملت اسلامیہ ہائی اسکول میں انگریزی کے ایک اُستاد کی جائیداد نکلی ہے۔'' خادم الدین نے اُمید بھری نظروں سے اقبال سر کی جانب دیکھا۔

''سب کا کہنا ہے کہ سوسائٹی کے صدر مولانا عمر فاروقی سے آپ کا بڑا یارانہ ہے۔ آپ اگر اُس کی سفارش کردیں تو.....''

''بھائی صاحب.....!''

''دیکھئے جناب انکار نہ کیجیے۔''

خادم الدین گڑگڑانے لگے: ''وہ آپ کا ہی شاگرد ہے۔ ہر امتحان اُس نے اچھے نمبروں سے کامیاب کیا ہے۔''

''لیکن اس سے پہلے کہیں.....''

''ارے صاحب کہاں نہیں اُس نے درخواست دی ہے۔ وہ انٹرویو بھی کامیاب کرلیتا، لیکن نوکری کو خریدنے کی رقم ہمارے پاس نہیں ہے۔'' خادم الدین کی صورت پر مسکینی ٹپک رہی تھی۔

''بس آپ ذرا.....''

اقبال سر نے نہایت محبت سے اپنے دونوں ہاتھ اُن کے کندھوں پر رکھا۔

''بھائی عمر فاروقی کا ظاہر کچھ ہے اور باطن کچھ ہے، دولت اُن کی کمزوری ہے، آپ کو کیسے سمجھاؤں، روپے نے سب رشتے بھلا دیئے ہیں اور میں ٹھہرا دوست، دولت کے مقابل ایک دوست کی سفارش کیا اثر دکھائے گی؟''

اُنہوں نے اُن سے آنکھیں چرائیں اور خاموشی سے آگے بڑھ گئے۔ وہاں موجود سارے لوگ ایک دوسرے کا منھ دیکھنے لگے اور خادم الدین نے تقریباً چلاتے ہوئے کہا:

''ہیڈ ماسٹر صاحب! آپ تو سرکار کے آدمی ہیں، اس بھرشٹاچار کے بارے میں حکومت کو کیوں نہیں لکھتے کہ وہ سارے خانگی اسکولوں کو اپنی تحویل میں لے لے، غریبوں کو کم از کم نوکری تو ملے گی؟''

لیکن اقبال سر نے ایک بار بھی پلٹ کر اُن کی طرف نہیں دیکھا، وہ کیسے حکومت کو یہ بات لکھ پاتے؟ اور کس حیثیت سے لکھتے؟ سارے خانگی اسکول اور کالجز یا تو منتریوں کے ہیں، یا پھر منتریوں کے قریب کے لوگوں کے ہیں۔

اُن کے پیچھے اب بھی ایک شور تھا:

سرکاری ملازمتیں تو نکلتی نہیں

اور جو نکلتی ہیں اُن پر رشتہ داروں کا قبضہ ہوجاتا ہے

مسلمانوں کے لیے سرکار کیا کررہی ہے؟

ارے سرکار کی بات چھوڑو

خود اپنے لوگ بھی لالچی ہوگئے ہیں

بنا پانچ دس لاکھ لیے تقرر ہی نہیں کرتے

تو آخر ہم غریب مسلمان کہاں جائیں؟

ہمارے بچوں کا مستقبل کیا ہوگا؟

گھر پہنچنے کے بعد بھی اقبال سر کے کانوں میں وہی آوازیں گونج رہی تھیں۔ جوں توں رات کٹی اور وہ صبح فجر کی نماز کے لیے اُٹھے تب بھی اُن کے کانوں میں وہی آوازیں تھیں، کیا اس ملک میں اب اپنوں اور غیروں نے روزی کے سارے ہی راستے مسدود کردیے ہیں؟ مسلمانوں کی بے بسی اور اُن کی مجبور زندگیاں اُن کی آنکھوں میں گردش کررہی تھی۔ اُن پر ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ اس ملک میں مسلمانوں کا مستقبل کیا ہوگا؟ بار بار یہی ایک سوال اُن کے دماغ پر ہتھوڑے برسا رہا تھا۔ فجر کی نماز کا وقت ہورہا تھا اُنھوں نے وضو کیا، نماز پڑھی اور تلاوت شروع کی کچھ ہی دیر میں اُن کے بدن میں کپکپی سی ہونے لگی اور کاغذ پر پھیلی ہوئی سورۃ رعد کی آیتیں اُن کے کانوں میں گونجنے لگیں:

''جو لوگ اللہ سے پختہ عہد کرکے اُسے توڑ ڈالتے ہیں
اور جن رشتوں کو جوڑے رکھنے کا اللہ نے حکم دیا ہے،
قطع کردیتے ہیں اور ملک میں فساد کرتے ہیں ایسوں پر
لعنت ہے اور ان کے لیے بُرا انجام ہے۔''

اقبال سر کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ خوف سے اُن کی آنکھیں بند ہوگئیں تو سارا عالم اسلام اُن کی آنکھوں میں تھا۔ وہ سجدے میں گر گئے۔ بے شک معبود ہم ہی خطا کار ہیں، ہم ہی نے اپنے وعدوں سے مکر کر اس عذاب کو اپنے آپ پر مسلط کرلیا ہے۔ اے خطاؤں کو معاف کرنے والے،

PDF Compressor Free Version

اے مہربان رب تو ہی ہم کو بچا سکتا ہے تو ہی ہماری رہنمائی کر سکتا ہے۔ اس عذاب سے نکلنے کا راستہ دکھادے، اے راستہ دکھانے والے......

وہ ابھی سجدے میں گڑگڑا ہی رہے تھے کہ فرحان نے اُنھیں اطلاع دی کہ کوئی پنڈت جی دیوان خانے میں بیٹھے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔

اقبال سر نے سجدے سے سر اُٹھایا اور بنا بیٹے کی طرف دیکھا آہستہ سے کہا:

''اُن سے کہیے ابھی حاضر ہوتا ہوں۔''

پنڈت جی بے چینی کے عالم میں کمرے میں ٹہل رہے تھے۔

''نمستے پنڈت جی۔''

پنڈت جی نے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا

''تشریف رکھیے۔۔آج کیسے راستہ بھٹک گئے آپ؟''

اقبال سر کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

''بات یہ ہے ماسٹر جی، اس شیتر میں گنیت میں آپ سے بڑا دوسرا کوئی مہارتھی نہیں ہے۔''

''یہ آپ کی محبت ہے جو ایسا سمجھتے ہیں۔''

''نہیں ماسٹر جی یہ محبت نہیں سب کا دشواس ہے۔''

پنڈت جی نے فخریہ نظروں سے اُن کی طرف دیکھا۔

''ہمارے اسکول میں اُسی گنیت، آپ کیا کہتے ہیں اُسے ......ہاں ریاضی......ریاضی کے ٹیچر کے لیے انٹرویو ہے۔ میری آپ سے بنتی ہے کہ آپ ہمارے لیے کسی اچھے ریاضی کے اُستاد کا چیئن کر دیں۔''

''کب ہے یہ انٹرویو......؟''

''آتے سوموار کو۔''

''جی حاضر ہو جاؤں گا۔''

''دھنیاواد...... چلتا ہوں۔ نمستے......''

''پنڈت جی چائے تو پیتے جایئے؟''

پنڈت جی نے ہاتھ جوڑے۔ ''ماسٹر جی چھما چاہتا ہوں۔ برہمن ہوں۔ میرا دھرم اس کی اجازت نہیں دیتا۔'' اور پھر وہ تیزی کے ساتھ دروازے سے باہر نکل گئے اور اقبال سر اُنھیں دیکھتے رہ گئے۔

اُن کے ذہن میں اُن کا بچپن گردش کرنے لگا، وہ اور کرشنا سوامی ساتھ ساتھ کھیلتے تھے، ساتھ ساتھ اسکول جاتے تھے۔ کرشنا کی ماتا جی پوجا کے لیے ہمارے گھر سے پھول لے جاتیں، اُنھوں نے جانے کتنی بار ہم دونوں کو ایک ہی پلیٹ میں کھانا کھلایا تھا۔ دونوں کس آزادی کے ساتھ ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے تھے۔ آج بھی جب وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ یہاں آتا ہے تو ایک دن ضرور میرے گھر میں گزارتا ہے، لیکن...... اُنھوں نے ٹھنڈی آہ بھری......اب تو یہ ساری باتیں گویا خواب ہو گئیں ہیں۔

اقبال سر عجب تناؤ بھری زندگی جی رہے تھے، لیکن پوری کوشش کرتے کہ اُن کے مزاج میں تنگ نظری پیدا نہ ہو۔ وہ ایک اُستاد تھے اور ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ اُستاد کو فراخ دل ہونا چاہیے۔ یہ اُسی کا منصب ہے کہ وہ نصابی علوم کے ساتھ ہی ساتھ اپنے شاگردوں میں اعلیٰ صفات بھی پیدا کرے، لیکن آئے دن کی خبریں اُن کے سامنے کئی سوالات بھی کھڑا کر دیتیں، کبھی سنگاپور کے مسلمانوں کی پٹنا، کبھی گلف کے حالات، کبھی دادری کا سانحہ، کبھی تنگ نظر سیاست دانوں کے بیانات اور کبھی اُن کے اپنے بچوں کا مستقبل اُنھیں بے چین کر دیتا۔

وہ وعدے کے مطابق ریاضی کے ایکسپرٹ کی حیثیت سے سوامتک ہائی اسکول پہنچے۔ اُن کے سامنے تقریباً پچاس اُمیدوار تھے۔ انٹرویو شروع ہوا اُنھوں نے مختلف سطحوں پر اُمیدواروں کو پرکھا، ہر راؤنڈس میں کچھ اُمیدوار چھٹتے چلے گئے۔ جب اُنھوں نے آخری راؤنڈ مکمل کیا تو اُن کی لسٹ میں صرف تین اُمیدوار تھے۔ اسکول کے سکریٹری پنڈت ہری پرشاد جی کے ہاتھوں میں لسٹ تھماتے ہوئے اُنھوں نے کہا:

''پنڈت جی ان تین ناموں میں حالانکہ سب سے عمدہ اُمیدوار شیخ حنیف ہے، لیکن میں نے اس کا نام تیسرے نمبر پر لکھا ہے، سیدھی سی بات ہے آپ کے ادارے میں اُسے نوکری تو ملنے والی نہیں، آپ اوپر کے دوناموں میں سے کسی کو بھی منتخب کر لیں۔''

پنڈت جی نہایت غور کے ساتھ اُن کی باتیں سن رہے تھے،

''ماسٹر جی آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ ہم شیخ حنیف کو نوکری

PDF Compressor Free Version

نہیں دیں گے، لیجیے میں نے اُس کے نام پر دستخط کر دیئے ہیں، اب ایکسپرٹ کی حیثیت سے آپ بھی دستخط کر دیں۔''

اقبال سر حیرت بھری نظروں سے اُن کی طرف دیکھنے لگے۔

''لیکن یہ ادارہ تو آر ایس ایس تنظیم کا ہے نا؟''

''سو فیصد درست۔''

''تو پھر.....!''

اقبال صاحب اب بھی مجسم حیرت بنے ہوئے تھے۔

''یہی انتر ہے آپ کی اور ہماری سوچ میں۔'' پنڈت جی نہایت ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتا رہے تھے:

''آپ بہت نزدیک دیکھتے ہیں اور ہم بہت دور تک دیکھتے ہیں، ہم نے بھی محسوس کیا، شیخ حنیف آپ کی طرح بہت اچھا اُستاد ثابت ہوگا، وہ کم سے کم ہمارے اسکول میں پچیس برس تک کام کرے گا، ان پچیس برسوں میں ہماری پچیس پیڑیوں میں سے جانے کتنے انجینئر اور ڈاکٹر بنیں گے، اس کے لیے ایک مسلمان کو نوکری دینا ہمارے لیے بہت چھوٹی سی بات ہوگی۔ دوسرے وہ جب تک بھی یہاں کام کرے گا، اچھا ہی کام کرے گا۔ ہم ایسا سمجھتے ہیں۔''

اقبال سر کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی، جس راستے کے لئے وہ کبھی اللہ سے گڑگڑا کر دعائیں مانگ رہے تھے۔ وہ راستہ اُنہیں اللہ نے دکھا دیا تھا اُنہوں نے دل ہی دل میں اُس کا شکر ادا کیا۔

عشاء کی نماز کے بعد اُنھوں نے سب کو ایک منٹ کے لیے روک لیا اور ممبر پر بیٹھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

''بھائیو! میں بہت دنوں سے پریشان تھا کہ اس ملک میں ایسے تعصب بھرے ماحول میں ہمارا مستقبل کیا ہوگا؟ ہمارے بچوں کی روزی روٹی کا کیا بنے گا؟ آج مجھے اُس کی کلید مل گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہمیں محنت مزدوری سے لے کر ہنرمندی کی آخری حد تک یعنی ہر میدان میں نمبر ون بننا ہوگا، ہم اُن کی ضرورت بنیں، اپنی محتاجی کے اسیر نہیں، ہمیں اپنے بچوں کے تعلیمی کریئر پر بھی پوری توجہ دینا ہوگی کہ وہ غلط راستوں سے کامیابی حاصل نہ کریں بلکہ اُن کے نتائج میرٹ میں آئیں۔ اگر ہم ایسا کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو یقین کریں ہم سے ہمارے شاندار مستقبل کو کوئی نہیں چھین سکتا۔'' وہ ممبر سے اُتر گئے اور اُنھوں نے دیکھا سب کے چہروں پر ایک عجیب طرح کا اطمینان قوس قزح کی طرح رنگ بکھیر رہا تھا۔ ❁❁

سوانح اور خاکہ نگاری کا فرق

سوانح نگاری اور خاکہ نگاری، ادب کی مشہور صنفیں ہیں اور کبھی ایسا لگتا ہے کہ یہ دونوں بالکل ایک جیسی ہیں، لیکن دراصل ایسا سمجھنا بڑی بھول ہوگی، کیونکہ کئی لحاظ سے ان دونوں کی نوعیت جداگانہ ہے۔ ماہرین نے ان دونوں صنف کی تعریف بھی الگ الگ کی ہے اور ان کے معیار، مقدار اور اجزا بھی الگ الگ بتائے ہیں۔ سوانح ایک شخص کی پوری زندگی کا احاطہ کرتی ہے اور ایسا نہ کر سکے تو وہ خود ادھوری رہ جاتی ہے جب کہ خاکے میں ایک شخص کی زندگی کا کوئی خاص پہلو ہی شامل رہتا ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ سوانح نگاری کا فن تفصیل و ترتیب کا فن ہے اور خاکہ نگاری کا فن اجمال اور صورت گری کا فن۔ سوانح زندگی کے اہم واقعات کا بیان ہے اور خاکہ شخصیت کے خاص رخ کی جھلک۔ سوانح اور خودنوشت سوانح میں یہ فرق ظاہر ہے کہ خودنوشت بعد از مرگ نہیں ہو سکتی جب کہ سوانح عموماً بعد از مرگ تحریر میں آتی ہے۔ سوانح نگاری کے لئے یہ لازم نہیں کہ لکھنے والا شخصیت کا ہم عصر ہو اور اس سے نزدیکی مراسم و ملاقات رکھتا ہو، جب کہ خاکہ نگاری کے لئے یہ شرط نہ سہی، رواج مسلسل کے مصداق ضرور ہے، کیونکہ بیشتر خاکہ نگار وہ ہیں جنہیں شخصیت سے قربت رہی ہے اور جنہوں نے شخصیت کا زمانہ پایا اور اسے دیکھا، سنا اور اس سے ملاقات کی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مناسب ذرائع سے مستند اور وافر مواد کی فراہمی کے بغیر سوانح نگاری کا کام نہیں ہو سکتا ہے جب کہ خاکہ نگار کی ضرورت بالعموم شخصیت کی معاصرت و قربت اور ملاقات سے پوری ہو جاتی ہے۔ سوانح نگاری منصوبہ بندی چاہتی ہے جب کہ خاکہ نگاری ایسے التزام کی طالب نہیں ہوتی، البتہ حسن سبک کے معاملے میں خاکہ، سوانح سے زیادہ حزم اور چیرہ دستی چاہتا ہے۔ افسانے کو زندگی کی ایک قاش کہا گیا ہے اور اسی انداز سے خاکے کو سوانح کی ایک قاش کہہ دیا جائے تو مضائقہ نہیں۔ (ماخوذ)

PDF Compressor Free Version

امین صدرالدین بھایانی

903-Misty View CT, Lilburn, GA-30047 (U.S.A.)

احمد انکل کے بچوں کا کیا ہوا؟

اُس کثیر منزلہ رہائشی عمارت کے مرکزی دروازے سے باہر آتے ہی وہ پانچ چھ سالہ بچہ اپنا سر اُٹھا کر عمارت کی بالائی منزل کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی توقع کے عین مطابق عمارت کی آخری منزل پر موجود گھر کے جھروکے سے چار بچے، جن میں تین لڑکے اور ایک لڑکی شامل تھی، نیچے گلی میں جھانک رہے تھے۔ اُس کی آنکھیں بچوں کی آنکھوں سے چار ہوئیں۔ حالانکہ اُن کے درمیان کافی فاصلہ تھا، لیکن پھر بھی وہ بچہ، اُوپر جھروکے سے جھانکتے بچوں کی آنکھوں سے ٹپکتی ویرانی، یاسیت، اداسی کی تاب نہ لاسکا اور نظریں اُن سے چراتے ہوئے اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ ذرا تیز تیز چلتا ہوا وہ اپنے ابو کے نزدیک پہنچا جو اپنی سرخ رنگ کی ہنڈا ففٹی موٹر سائیکل کو پے در پے ککیں مار کر اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد موٹر سائیکل کا انجن پھٹ پھٹ پھٹ پھٹ کرتا جاگ پڑا۔ بچہ فوراً ہی موٹر سائیکل کے ہینڈل اور سیٹ کے درمیان لگی سرخ ٹوکری میں جا بیٹھا۔ پیچھے اُس کی امی، جنھوں نے اپنی گود میں اُس کے چھوٹے بھائی کو لیا ہوا تھا، سوار ہوگئیں، اِس کے ساتھ ہی موٹر سائیکل چل پڑی۔ سارے راستے اُس کی نگاہوں میں عمارت سے جھانکتے بچوں کے اداس چہرے گھومتے رہے۔ وہ بالکل خاموشی کے ساتھ چلتی ہوئی موٹر سائیکل کی ٹوکری میں بیٹھا بظاہر اردگرد دوسری گاڑیوں کو تیزی کے ساتھ گزرتے ہوئے دیکھ رہا تھا، لیکن اُس کی آنکھیں تو بس محض خلاؤں میں گھور رہی تھیں۔ اُس کے دل و دماغ پر تو بس اُن بچوں کی نگاہوں میں بسی ویرانی اور ٹپکتی یاسیت ہی چھائی ہوئی تھی اور ذہن میں رہ رہ کر ایک ہی سوال اُبھرتا تھا کہ:

اب احمد انکل کے بچوں کا کیا ہوگا.....؟

اب کون اُن کے اسکول کی فیس ادا کرے گا.....؟

کون اُن کو کتابیں..... یونیفارم..... کپڑے اور جیب خرچ دیا کرے گا؟

اُس کا ننھا سا ذہن اُن تمام سوالات کے جوابات دینے سے قطعاً قاصر تھا۔ جیسے جیسے یہ سوالات یکے بعد دیگرے اُس کے ذہن میں آتے چلے جا رہے تھے ویسے ویسے اُس کے دل پر ایک عجیب سی اداسی چھاتی چلی جا رہی تھی۔ ایک ہلکے سے نامعلوم خوف کے سبب اُس کا ننھا سا دل قدرے تیز تیز دھڑکنا شروع ہوگیا تھا۔ اُس نے سر گھما کر اپنے ابو کی طرف دیکھا جو اُس کی اندرونی کیفیات سے یکسر بے خبر، مکمل یکسوئی کے ساتھ سڑک کی جانب دیکھتے ہوئے موٹر سائیکل چلانے میں مصروف تھے۔ ابو کا چہرہ دیکھ کر نہ جانے کیوں اُس نے خود کو بے حد پُرسکون سا محسوس کیا اور اپنی پیٹھ اور سر کو ابو کے جسم سے مس کر دیا۔ ایسا کر کے اُسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اب وہ بالکل محفوظ ہے۔

گھر پہنچ کر بھی وہ بس خاموش خاموش سا ایک کونے میں جا بیٹھا اور مسلسل ان بچوں کے متعلق ہی سوچتا رہا۔ اس روز گھر کا سارا ماحول بھی کچھ سوگوار سوگوار سا ہو رہا تھا۔ ابو اور امی کے چہروں سے بھی اداسی جھلک رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ابو تصویروں سے بھرا ایک البم کھول کر بیٹھ گئے۔ ایک کے بعد ایک صفحہ پلٹتے جاتے اور اُس میں لگی تصاویر دیکھتے ہوئے تفصیل امی کو بتاتے جاتے۔ ایک مقام پر آ کر تو ان کا لہجہ بے حد جذباتی اور آواز قدرے بھاری سی ہوگئی:

''ارے دیکھنا ذرا، یہ احمد کی شادی کے موقع کی تصویر ہے اور احمد کا شہ بالا میں بنا تھا۔''

وہ بچہ بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنے ابو کے پاس جا بیٹھا اور ان تصاویر کو بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ ایک تصویر میں احمد انکل دلہا

PDF Compressor Free Version

بنے ہوئے ہیں اور نکاح پڑھایا جا رہا ہے۔ بالکل ساتھ ابو بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ اگلی تصویر میں احمد انکل نکاح نامے پر دستخط کر رہے ہیں اور برابر بیٹھے ابو انہیں دیکھ کر مسکرا رہے ہیں۔

''تمھیں یاد ہے نا کہ ہم ان دنوں عیدگاہ میدان کے علاقے میں سول ہسپتال کے عقب میں واقع راجہ مینشن میں رہا کرتے تھے۔'' ابو نے امی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں بس احمد بھائی کو اللہ نے بہت جلد ہی اپنے پاس بلا لیا، حالانکہ ان کی تو شادی بھی ہمارے بعد ہوئی تھی۔'' امی نے انتہائی تاسف زدہ لہجہ میں ابو کو جواب دیتے ہوئے کہا۔

''اور آج جب ہم اُن کے گھر گئے تھے تو مجھ سے تو ان کی بیوی اور بچوں کی اداس صورتیں دیکھی نہیں جا رہی تھیں۔''

ابو نے البم کا صفحہ پلٹ دیا۔ اب اس صفحے میں لگی تصاویر میں ابو، امی، احمد انکل اور ان کی بیگم سب ایک بڑی لانچ میں سوار ہیں۔ لانچ سمندر کا سینہ چیرتی چلی جا رہی ہے۔ سب کے چہروں سے مسکراہٹیں اور خوشیاں جھلک رہی ہیں۔ وہ سب ایک دوسرے کو ہنستے مسکراتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ ان سب کے دمکتے چہروں سے عیاں تھا کہ وہ سب خوب لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ ان تصاویر کو دیکھ کر ابو کے چہرے پر ایک غمگین سی مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ امی کی طرف دیکھ کر گویا ہوئے:

''یاد ہے ناتم کو، شادی کے چند ہی روز بعد ایک روز صبح صبح اپنی بیوی کو لے کر احمد ہمارے گھر راجہ مینشن آیا تھا، پھر ہم سب لوگ کیماڑی سے لانچ میں سوار ہو کر منوڑا جزیرے کی سیر کرنے گئے تھے۔''

وہ بچہ یہ بات سمجھنے سے قاصر تھا کہ اِن تصاویر میں موجود افراد اِس قدر خوش وخرم نظر آ رہے ہیں۔ اب اچانک احمد انکل کیسے باقی سب لوگوں کو حیران و پریشان چھوڑ کر اللہ میاں کے پاس چلے گئے؟

ابو تو سارے گھر کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے اسے کبھی کسی بات کی کوئی فکر لاحق نہیں ہوتی۔ ہاں البتہ کبھی کبھار جب ابو دفتر سے رات بہت دیر گئے واپس آتے تو ان کے آنے سے قبل اس کے ننھے سے دل و دماغ میں طرح طرح کے اندیشے اور وسوسے کلبلانے لگتے۔ اگر خدانخواستہ ابو کو کچھ ہو گیا اور اگر اللہ نہ کرے کہ وہ گھر واپس ہی نہ آئے تو پھر اس کا، اس کے چھوٹے بھائی اور امی کا کیا ہوگا؟ کون اسکول کی فیس ادا کرے گا؟ کون ان کو کتابیں، یونیفارم، کپڑے خرید کر دے گا، کون جیب خرچ دیا کرے گا اور وہ سب لوگ کھانا کیسے کھائیں گے؟ اب احمد انکل کے جانے کے بعد ان کے بچوں کی یہ تمام تر ذمہ داریاں بھلا کون اٹھائے گا؟

ہر چھٹی والے دن جب ابو اسے اپنی موٹر سائیکل پر تو کبھی پیدل ہی ٹاور، بولٹن مارکیٹ اور ریگل صدر پر زمین پر لگنے والے پرانی کتابوں کے پتھاروں پر اکڑوں بیٹھ کر پرانی کتابوں کو کھنگالتے تو وہ بھی ان ہی کی طرح سے ان کے برابر اکڑوں بیٹھ جاتا اور ان نہ سمجھ میں آنے والی موٹی موٹی کتابوں کو اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں بمشکل تھام کر ان کے صفحے پلٹتا تو اسے اپنے دل میں بڑی طمانیت سی محسوس ہوتی۔ وہ خود کو دل ہی دل میں اُن کتابوں کو پڑھے بنا ہی اپنے ابو کی طرح سے کوئی بڑا ہی قابل اور عالم فاضل قسم کا انسان محسوس کرتا، لیکن اب احمد انکل کے بچے بھلا کیسے اِس عظیم احساس سے بہرہ مند ہو سکیں گے؟

جس طرح سے وہ اپنے ابو کے ہمراہ کھارادر میں قائداعظم کی جائے پیدائش وزیر مینشن کی نچلی منزل میں قائم لائبریری تو کبھی بندر روڈ پر ''خالقدینا ہال'' لائبریری، رنچھوڑ لین میں صدیق بابا کی ''ہلال لائبریری'' اور کبھی کلفٹن بریج شروع ہونے سے کچھ ہی پہلے قائم فریئر ہال کی پرشکوہ عمارت میں موجود لائبریری میں جا کر ان کی فضاؤں میں پھیلی کتابوں کی مخصوص خوشبو کو اپنے دل و دماغ میں رچا بسا کر، آنے والے کئی دنوں تک محسوس کرتا اور اپنے دل میں دوبارہ وہاں جا کر اپنے اسی احساس کی تجدید نو کرنے کی دل ہی دل میں سعی کرتا۔ اس طرح اب احمد انکل کے بچوں کو بھلا کون اِن لائبریریوں میں لے جایا کرے گا اور وہ کیسے ان کتابوں کی پیاری پیاری خوشبوؤں کو اپنے دل و دماغ میں مقید کر سکیں گے؟

اکثر رات کو کھانے کے بعد وہ ابو کے ہمراہ گھر سے کچھ ہی فاصلے پر موجود ''حبیب بنک پلازہ'' کے عین سامنے والے مکمل تاریکی میں ڈوبے انگریزوں کے دور کے بنے پل پر جایا کرتا۔ پل پر کھڑے ہو کر اسے وہاں سے تھوڑے سے ہی فاصلے پر موجود سٹی ریلوے اسٹیشن کی روشنیاں اور طویل سفر پر روانہ ہونے سے قبل ریل گاڑیوں کے شیٹنگ

PDF Compressor Free Version

کرتے انجن نظر آتے، جو رات کے سناٹے اور تاریکی میں پل کے نیچے سے زور زور سے سیٹیاں بجاتے ہوئے گزرتے اور اپنا سیاہ دھواں اڑاتے ہوئے اپنے پیچھے ڈیزل اور موبل آئل کی ملی جلی بو سے فضا کو آلودہ کر جاتے۔ اب احمد انکل کے بچے اُس اندھیرے پل پر دور سے نظر آتی سٹی اسٹیشن کی روشنیوں اور ان شنٹنگ کرتے ریلوے انجنوں اور اپنے پیچھے چھوڑ جانے والے دھوئیں اور اُس میں سے آتی ڈیزل اور موبل آئل کی ملی جلی بو سے کیسے آشنا ہو سکیں گے؟

وہ اکثر اپنے ابو کے ہمراہ ان کے دفتر جایا کرتا، وہاں نصب خودکار ٹیلی پرنٹر از خود چلتا ہوا کاغذ پر زور زور سے کھٹ کھٹ کھٹ کرتا انگریزی میں نہ معلوم کیا کچھ ٹائپ کرتا، پھر ٹائپ شدہ کاغذات اس بڑی سی مشین سے خود بخود باہر آتے۔ ہر تھوڑی دیر بعد دفتر کا کوئی کارندہ آ کر اُن کاغذات کو ٹیلی پرنٹر سے کاٹ کر لے جاتا۔ وہ دیر تک خاموش کھڑا یہ سب کچھ دیکھتا۔ جب تھک جاتا تو پھر اپنے ابو کی میز پر رکھے سیاہ رنگت والے فون کے بھاری بھرکم چونگے کو بمشکل تمام اٹھا کر اپنے چہرے پر رکھنے کی کوشش کرتا جو کہ اس چونگے کے تناسب سے کہیں زیادہ چھوٹا تھا۔ کان پر لگاتا تو کبھی اس کا منھ اس کی پہنچ سے بہت ہی دور رہتا اور منھ کے قریب لانے کی کوشش کرتا تو اسپیکر کان سے کہیں اوپر ہوا ہی میں معلق رہتا۔ جوں توں کر کے وہ فون کے چونگے کو چہرے پر رکھ کر اپنی ننھی منی انگلیوں سے فون کے ڈائل پر بس اندھا دھند نمبر گھماتا رہتا۔ فون اکثر کسی نامعلوم مقام پر جا لگتا اور پھر دوسری جانب سے آنے والی بھاری بھرکم سی آواز سن کر ہمیشہ کی طرح سے گھبرا کر چونگا واپس فون کے کریڈل پر رکھ دیتا۔ یہ سب کر کے وہ خود کو اس اخباری دفتر کا جہاں اس کے ابو کام کرتے تھے، کوئی اعلیٰ کارکن تصور کرنے لگتا۔ یہ احساس اسے بے حد اعتماد بخشتا، مگر اب احمد انکل کے چلے جانے کے بعد بھلا وہ اعتماد ان کے بچوں کو کیسے میسر آ سکے گا؟

نچلے متوسط طبقے کا یہ گھرانا دھیرے دھیرے اپنے معمولات زندگی میں مشغول ہوتا چلا گیا۔ وقت کا پہیہ اپنی غیر محسوس رفتار سے چلتا رہا۔ اس واقعہ کو لگ بھگ دس برس کا عرصہ بیت گیا۔ اب وہ بچہ ایک سولہ برس کے نوجوان کا روپ دھار چکا ہے اور کورنگی انڈسٹریل ایریا میں واقع نیشنل آئل ریفائنری کے عقبی علاقے چمڑہ منڈی میں قائم ایک لیدر فیکٹری سے باہر نکل رہا ہے۔ اس نے ہاتھ میں تھامی ہوئی کتابوں کو یکجا کر کے انہیں از سرِ نو مضبوطی سے پکڑ لیا اور پھر ایک دم سے دوڑ لگا دی۔ یہ اس کا روز کا معمول تھا۔ وہ اس لیدر فیکٹری کے اندر قائم دفتر میں بطور آفس اسسٹنٹ کام کرتا تھا۔ شام پانچ بجے چھٹی ہوتی تو وہ اپنی فرسٹ ایئر کی کتابوں کو بغل میں داب کر فوراً وہاں سے چمڑہ چورنگی کے بس اسٹاپ پر جو کم از کم ایک میل کے فاصلے پر تھا، پہنچنے کے لئے روڑتا، کیونکہ اسے شام چھ بجے تک ناظم آباد، انکوائری آفس کے بس اسٹاپ پر موجود گورنمنٹ پریمیئر ایوننگ کالج پہنچنا ہوتا تھا۔ چمڑہ چورنگی سے ملنے والی بس صرف صدر امپریس مارکیٹ تک ہی چھوڑتی تھی اور پھر وہاں سے اسے دوسری بس پر سوار ہو کر کالج پہونچنا ہوتا تھا، لہٰذا آفس سے چھٹی ہوتے ہی وہ بس اسٹاپ تک کا سارا راستہ بھاگ کر طے کرتا۔

کم و بیش روزانہ ہی جب وہ اپنے آفس سے نکل کر بس اسٹاپ تک پہنچنے کے لئے سڑک کے کنارے بھاگ رہا ہوتا تھا تو اسے احمد انکل کے بچے ضرور یاد آتے کہ آخر احمد انکل کے بچوں کا کیا ہوا ہوگا؟ ان کے تو ابو بہت پہلے ہی فوت ہو گئے تھے۔ ضرور بیچارے سخت مشکلات کے شکار ہو کر زندگی کی اِس مشکل دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئے ہوں گے۔

بھاگتے بھاگتے بھی اس کے ذہن میں یہ خیال آتا کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس کے ابو زندہ ہیں جن کے ہوتے ہوئے اس نے نہ صرف میٹرک تک تعلیم بھی حاصل کر لی ہے بلکہ انہوں نے اپنے ایک واقف کار کے پاس بھجوا کر نوکری بھی دلوا دی جنھیں شہر سے دور اپنی فیکٹری میں قائم دفتر کے لئے ایک ایسے آفس اسسٹنٹ کی ضرورت تھی جو ٹائپنگ کے علاوہ دیگر دفتری امور میں ان کا ہاتھ بٹا سکے۔ اب وہ نہ صرف نوکری کر رہا تھا بلکہ ساتھ ہی ساتھ شام کے کالج میں فرسٹ ایئر کامرس کی کلاسیں بھی باقاعدگی کے ساتھ لے رہا تھا۔ ہاں البتہ اتنا ضرور تھا کہ اس کے آفس اور کالج کے درمیان کافی فاصلہ تھا، لہٰذا اسے ہر روز وقت پر کالج پہنچنے کے لئے بس اسٹاپ تک دوڑ لگا کر جانا پڑتا۔ صرف اتنا ہی نہیں عموماً بس اسٹاپ سے صدر جانے والی بس کے پائیدان پر بھی سفر کرنا پڑتا، کیونکہ وہ وقت ہی ایسا ہوا کرتا تھا کہ اُس سارے انڈسٹریل ایریا میں قائم دفاتر

PDF Compressor Free Version

اور کارخانوں میں کام کرنے والوں کی چھٹی اسی وقت ہوا کرتی تھی۔ ایسے میں اگر کسی کو صدر جانے والی بس کے پائیدان پر اپنے دونوں اور اکثر اوقات تو محض ایک ہی پاؤں جمانے بھر کو بھی جگہ میسر آجائے تو اسے بھی خوش نصیبی ہی سے تعبیر کیا جانا چاہیے۔

جب بس صدر ایمپریس مارکیٹ پہنچتی تو وہ فوراً بس سے اترتا اور دوبارہ بھاگ کر ناظم آباد، انکوائیری آفس جانے والی وہ بس پکڑتا جو بسوں کی قطار میں سب سے آگے کھڑی ہوتی، کیونکہ آگے والی بس پہلے نکلتی اور وہ جلد از جلد اپنے کالج پہنچ سکتا تھا، مگر اب یہ اور بات ہے کہ اس قدر بھاگ دوڑ کے باوجود بھی کالج پہنچتے پہنچتے پہلا پیریڈ ہمیشہ ضائع ہی ہو جایا کرتا تھا، لیکن چونکہ پہلا پیریڈ اردو کا ہوا کرتا تھا اور انتہائی چھوٹی عمر سے ہی ابن صفی کے جاسوسی ناول پڑھ پڑھ کر اس کی اردو کافی اچھی ہوگئی تھی، وہ اردو کے مضمون میں ہمیشہ سے ہی اچھا رہا تھا، لہٰذا اسے کوئی خاص فرق نہ پڑتا تھا۔

وہ اکثر سوچتا کہ کسی روز فرصت میں ابو سے احمد انکل کے بچوں کے بارے میں ضرور دریافت کرے گا، لیکن اپنی ہفتے میں چھ روزہ جاب، تعلیمی مصروفیات اور اس کے بعد جس قدر وقت بچ رہتا وہ کتابیں پڑھنے اور لکھنے لکھانے میں مشغول رہتا۔ اکثر ابو سے مختلف موضوعات پر بھرپور گفتگو بھی رہتی۔ دورانِ گفتگو اسے احمد انکل یاد بھی آتے، لیکن نہ جانے کیوں وہ چاہنے کے باوجود بھی کبھی ابو سے ان کے بارے میں کوئی سوال نہ کر سکا اور نہ ہی کبھی ابو ہی نے ان کے بارے میں کچھ تذکرہ کیا۔

انہی مصروفیات میں شب و روز گزرتے چلے گئے۔ ایک روز اپنے دفتر میں ہی اخبار میں چھپے انٹرمیڈیٹ کے نتائج میں اس نے اپنا رول نمبر فرسٹ ڈویژن کے کالم میں پایا۔ اپنے ساتھی کارکنوں کی مبارکباد وصول کرتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کیا اور اپنی پیٹھ آپ ٹھونک کر خود کو شب و روز کی محنت اور بھاگ دوڑ کا اتنا اچھا پھل پانے پر جہاں مبارک باد پیش کی وہیں یک لخت وہی دیرینہ سوال اس کے ذہن کے کسی نہاں خانے سے پھر ابھر کر گونجنے لگا:

''احمد انکل کے بچوں کا بھلا کیا ہوا ہوگا؟''

ایک بار پھر وہ اپنی زندگی کے اگلے مراحل کی تکمیل میں جت گیا۔ وقت اپنی خاموش، مگر نپی تلی رفتار سے گزرتا رہا۔ کچھ اور برس بیت گئے۔ اب وہ گریجویشن کر چکا ہے اور پھر اس کی شادی بھی ہوگئی۔ شادی کے کچھ عرصے کے بعد اللہ نے اسے ایک انتہائی پیاری سی بیٹی کا باپ بنا دیا۔ چند برسوں میں وہ اپنے اور اپنے اہل خانہ کے اعلیٰ مستقبل کے لیے امریکہ چلا گیا اور کچھ ہی عرصے کے بعد اپنے بیوی بچوں کو بھی اپنے پاس بلوا لیا۔

یہ ۲۰۰۵ء کی بات ہے۔ اب احمد انکل کو اس جہانِ فانی سے کوچ کیے کم و بیش تیس سالوں کا طویل عرصہ بیت چکا ہے۔ اللہ کے حکم سے خود اس کے اپنے ابو بھی ایک برس قبل اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ بفضل خدا وہ ایک پیاری سی بیٹی کے ساتھ ایک پیارے سے بیٹے کا باپ بھی بن چکا ہے، لیکن آج بھی اکثر اس کے ذہن میں وہی تیس برسوں پرانا سوال گونجتا ہے:

''آخر احمد انکل کے بچوں کا کیا ہوا ہوگا؟''

اب وہ امریکی ریاست فلوریڈا کے ایک چھوٹے، مگر انتہائی مقبول سیاحتی و ساحلی قصبے ڈیٹونا بیچ میں جاب کے سلسلے میں اپنے اہل خانہ کے ہمراہ مقیم ہے۔ وہاں سے اتوار کے اتوار وہ اپنے بیوی بچوں سمیت قریباً ستر میل دور اورلینڈو شہر ڈرائیو کر کے جاتا۔

ایک اتوار کی شام حسب معمول وہ سب اورلینڈو جانے کے لئے نکلے، لیکن اسے یہ معلوم نہ تھا کہ آج کا سفر اس کے پچھلے تمام سفروں سے بالکل مختلف ہے، کیونکہ آج کا یہ سفر اسی دیرینہ سوال کے جواب کی طرف لے کر جا رہا تھا جو اس کے ذہن میں گزشتہ تیس سالوں سے جواب طلب تھا، جس کے ملنے کی امید اب ویسے بھی ابو کے انتقال کے بعد اس کے دل میں بالکل باقی نہ رہی تھی۔

مقام مطلوبہ پر پہنچ کر اور پھر وہاں سے فارغ ہو کر جب وہ اپنے بیوی بچوں کو لے کر واپس گھر جانے کے لئے نکل رہا تھا تو لوگوں کے ہجوم میں اس کی نظر ایک ایسی خاتون پر پڑی جسے وہ دیکھتے ہی پہلی ہی نظر میں پہچان گیا! وہ کوئی اور نہیں، احمد انکل کی بیوہ تھیں۔

ماہ و سال کی گرد نے ان کا چہرہ گدلا ضرور دیا تھا، لیکن اس نے انہیں پہچاننے میں ہرگز کوئی غلطی نہ کی تھی۔ وہ سو فیصدی وہی تھیں۔ اس نے اپنی بیوی کو دھیرے سے کہنی ماری اور اپنی آنکھوں سے اشارہ کرتے ہوئے

PDF Compressor Free Version

ان کی طرف متوجہ کیا اور اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا:

"ارے یہ انہی احمد انکل مرحوم کی بیوہ ہیں جن کے بارے میں اکثر ذکر کرتا رہتا ہوں۔ مجھے ان سے ضرور ملنا ہے۔ آج تو مجھے یہ ضرور جاننا ہے کہ آخر ان کا اور ان کے بچوں کا کیا ہوا؟"

وہ تیر کی طرح سے ان کے پاس جا پہنچا اور اپنی جانب متوجہ کر کے ان سے گویا ہوا:

"اگر آپ برا نہ مانیں تو کیا میں آپ سے کچھ پوچھ سکتا ہوں؟" انہوں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کیا آپ کے شوہر کا نام احمد تھا؟"

سوال سن کر ان کے چہرے پر ایک عجب سی حیرانی چھا گئی اور وہ بولیں:

"ہاں بیٹا ان کا نام احمد ہی تھا، لیکن تم ان کو بھلا کیا جانو۔ ان کے تو انتقال کو بھی کوئی تمیں ایک برس بیت گئے ہیں۔"

اپنی پہچان کی یقین دہانی کر چکنے کہ بعد جب اسے مکمل اطمینان ہو گیا کہ یہ وہی ہیں تو اُس نے اپنا تعارف کروایا۔

"جی میرا نام امین ہے اور میں آپ کے مرحوم شوہر احمد انکل کے دیرینہ دوست صدرالدین کا بیٹا ہوں۔"

"کون صدرالدین؟"

وہ اپنے حافظے پر زور ڈالتی ہوئی بولیں۔

"جی وہی صدرالدین بھایانی جو آپ کی شادی پر احمد انکل کے شہ بالا بنے تھے۔" میں نے انہیں یاد دلاتے ہوئے کہا۔

یہ سنتے ہی ان کی بوڑھی آنکھوں میں ایک ہلکی سی چمک نظر آئی۔ "اوہ، اچھا تو تم ان کے بیٹے ہو۔ کیسے ہیں اب وہ؟" ان کے چہرے پر شناسائی کی جھلک نظر آنے لگی۔

"جی ان کا تو گزشتہ برس پاکستان میں انتقال ہو گیا تھا۔"

میں نے دھیرے سے کہا۔

"اور تمہاری امی، وہ کہاں ہیں؟"

انہوں نے افسردہ لہجے میں دریافت کیا؟

"جی وہ تو فی الحال پاکستان میں ہی ہیں، لیکن میں کوشش کر رہا ہوں اور انشاء اللہ انہیں بھی یہیں اپنے پاس بلوا لوں گا۔"

اب اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور نیا سوال کرتیں، میں نے ہی ان سے وہ سوال کر ڈالا جو کہ گزشتہ تمیں برسوں سے میرے ذہن میں کلبلا رہا تھا۔

"آنٹی آپ کے تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی وہ سب اب کہاں ہیں؟"

"بیٹا وہ تو سب کے سب اب امریکی شہری بن چکے ہیں۔ بچوں میں سب سے بڑی تو میری بیٹی ہے جس کی بہت سالوں قبل ایک پاکستانی نژاد امریکی نوجوان سے شادی ہو گئی تھی اس کا کیلیفورنیا میں اپنا کاروبار ہے۔ ماشاء اللہ وہ خوش و خرم زندگی گزار رہی ہے۔ میرے بیٹے بھی عرصہ دراز ہوئے امریکہ آ گئے تھے اور ریاست ٹکساس میں مقیم ہیں اور اپنے اپنے کاروبار میں مصروف ہیں۔ میں اپنے بچوں کے پاس یہیں امریکہ میں ہی مقیم ہوں اور یہاں اورلینڈو اپنے ایک عزیز کے بچوں کی شادی میں شرکت کی غرض سے آئی ہوں۔"

اس روز اورلینڈو سے ڈیٹونا بیچ کا ستر میل کا سفر کرتے ہوئے میرے دل و دماغ میں بس یہی بات گردش کر رہی تھی:

"بے شک اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے"

اسی روز مجھ پر یہ راز بھی افشا ہوا کہ آخر اس سوال کے جواب کو پاتے پاتے تمیں سالوں کا طویل ترین عرصہ ہی کیوں لگا؟ شاید اللہ تعالیٰ مجھ پر یہ بات اپنے پورے اور مکمل انجام پر ہی آشکار کرنا چاہتا تھا کہ وہ کتنا بڑا مسبب الاسباب ہے۔ اللہ نے میرے سوال کا جواب خود مجھ پر دنیا کے اس کونے پر آشکار کیا کہ جہاں مجھے اس کے ملنے کی کوئی موہوم سی امید بھی نہ تھی۔ یہ سوال میرے ذہن میں شہر کراچی میں اس وقت جاگا تھا جب میں صرف چھ سال کا ایک کمسن اور ناسمجھ سا بچہ تھا اور اس کا جواب مجھے تمیں سال بعد ہزاروں میل دور سات سمندر پار خود میرے سامنے لا کر اس وقت فراہم کیا جب وہی چھ سال کا ایک کمسن اور ناسمجھ سا بچہ چھتیس سالہ دو بچوں کا باپ بن چکا تھا اور اس سوال کا جواب مکمل طور پر پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔

کچھ عرصے بعد جب امی میرے پاس امریکہ آ گئیں اور

(بقیہ ص ۶۵ پر)

PDF Compressor Free Version

اقبال سلیم

No. 97, Aiwan-c-Tahcra, 4th Main, 8th Cross, J.H.B.C.S. Layout
J.P. Nagar Post, Bangalore 560078

خلیج

دستک کی آواز پر میں نے دروازہ کھولا تو احمد کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے شک سا ہوا کہ شاید مجھ سے پہچان کی غلطی ہوئی ہے۔ اُترا ہوا چہرہ، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے، بے ترتیب کپڑے، مگر وہ احمد ہی تھا مجھے یقین کرنا پڑا۔ پستہ قد، مگر بھرے بھرے جسم کا گول مٹول احمد اس وقت سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا، وہ مجھ سے ملنے آیا تھا۔ میں اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر خود ہی اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا:

''اچھے تو رہے؟''

ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ابھری:

''جی! بس زندہ ہوں۔''

''کیا بیمار پڑ گئے تھے؟''

''نہیں!''

''تمہاری دلہن تو اچھی ہیں؟ کوئی بچہ وچہ؟''

اس کے چہرے کی اداسی گہری ہو گئی۔

''نہیں شادی کے بعد صرف ڈیڑھ برس میں سسرال میں رہا تھا۔ اب ایک کمرہ کرائے پر لے کر رہ رہا ہوں۔''

میں مسکرایا:

''کیوں کیا دلہن پسند نہیں آئی؟''

''نہیں یہ بات نہیں، میں خود ہی دلہن کو پسند نہ تھا۔''

میں نے چونک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا:

''کیا کہہ رہے ہو؟ کیا کوئی یقین کرے گا۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ سورج مشرق کی بجائے مغرب سے نکلے۔''

اس نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا۔ اس کے چہرے پر بلا کا کرب تھا:

''آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ رشتہ مجھ سے زیادہ میری سسرال والوں کو پسند تھا۔ آپ خود بھی شادی میں شریک ہوئے تھے، آپ کو یاد ہوگا کہ انہوں نے شادی کس چاؤ سے رچائی تھی۔ میں گھر کا لڑکا تھا۔ سالہا سال سے ان کے درمیان رہتا آیا تھا۔ وہ میری خوبیوں اور کمزوریوں سے خوب واقف تھے۔ اب وہ کہتے ہیں کہ میں سرے سے مرد ہی نہیں ہوں۔'' احمد کہتا رہا۔

''مجھے ہرگز امید نہ تھی کہ وہ لوگ مجھے اس طرح بدنام کریں گے، جن لوگوں نے اپنے بیٹے کی طرح میری پرورش کی، آج وہی دشمنوں کی طرح میرے جذبات سے کھیل رہے ہیں۔''

''آخر یہ الزام کس بنیاد پر تھا؟''

''ریحانہ کی مجھ سے سرد مہری اور بے اعتنائی..... میں ڈیڑھ سال گزرنے کے باوجود ایک بچے کا باپ نہیں بن سکا تھا۔''

''کیا بات ہوئی؟'' حیران ہو کر میں نے پوچھا۔

''یہ سراسر ظلم ہے، کوئی جواز نہیں، اولاد تو کسی کو بیس برس بعد بھی ہو سکتی ہے، پھر کیا یہ ضروری ہے کہ اس محرومی کا ذمہ دار مرد ہی ہو، عورت کیوں نہ ہو، عورت بانجھ بھی ہو سکتی ہے۔ کیا کوئی اس بات کو نظر انداز کرنے کی ہمت کر سکتا ہے۔''

''کاش اتنی عقل ان لوگوں کو خدا نے دی ہوتی۔''

احمد نے ایک کرب کے عالم میں جواب دیا۔

''حقیقت یہ ہے کہ شادی کے فوراً بعد ریحانہ کا برتاؤ ایسا ہو گیا جو شوہر اور بیوی کے درمیان روا نہیں ہوتا۔ دوسرے الفاظ میں ریحانہ کو مجھ سے نفرت ہو گئی تھی۔''

''آخر اس نفرت اور سرد مہری کی کوئی وجہ بھی تو ہو گی؟''

''وہی تو اصل مسئلہ ہے۔'' وہ قدرے جھجک کر بولا:

PDF Compressor Free Version

''کیا آپ یقین کریں گے کہ مجھ سے بات تک نہیں کرتی تھی۔ کمرے میں سوتی ضرور تھی، مگر الگ تھلگ۔ ایک کونے میں چٹائی بچھا کر، آج تک اس نے مجھے چھونے تک نہیں دیا ہے۔ کبھی ہاتھ پکڑا تو مچھلی کی طرح تڑپ کر میری گرفت سے نکل جاتی تھی۔ میں ان لوگوں سے یہ سب کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ ایک دن تنگ آ کر اپنی ایک دور کی رشتہ دار سے یہ بات کہہ دی۔ اس نے گھبرا کر میری سسرال والوں کو ساری باتیں بتا دیں اور یہ بھی کہا کہ لڑکی پر کسی جن کا سایہ ہے، لہٰذا اسے کسی عامل کے پاس لے جائیں۔ یہ سن کر پہلے تو وہ لوگ بھڑک اٹھے، پھر اس کے سمجھانے بجھانے پر ایک عامل کے پاس لے گئے۔ اس نے فال دیکھی اور چند تعویذ گنڈے بھی دیے، مگر کچھ فائدہ نہیں ہوا تو اس شریف آدمی نے صاف کہہ دیا کہ لڑکی اچھی بھلی ہے اس پر کوئی سایہ وغیرہ بالکل نہیں۔ اس کے بعد ان لوگوں کا رخ میری طرف ہو گیا۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ یہ سب ہماری لڑکی کو بدنام کرنے کی ایک چال ہے اور یہ لڑکا عورت کے لائق نہیں۔ اسے خود اپنا طبی معائنہ کروانا چاہئے۔ اب میں ہر طرف سے مایوس ہو کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ آپ میری مدد کریں، آخر کب تلک میں یوں ہی جلتا کڑھتا رہوں گا۔ تہمت برداشت کرنے کی ایک حد بھی ہوتی ہے۔''

میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور پوچھا:

''یعنی تم چاہتے ہو کہ میں چل کر ان لوگوں کو سمجھاؤں؟''

''ہاں میں یہ چاہتا ہوں۔''

''بہت اچھا!''

میں نے ہمدردی سے اس کا شانہ تھپکا اور وعدہ کیا کہ جلد ہی گاؤں جا کر ان لوگوں سے ملوں گا۔ اتنا سن کر وہ رخصت ہو گیا۔

میں رات کا کھانا کھا کر بستر پر لیٹا تو احمد کی باتیں کانوں میں بازگشت کرنے لگیں۔ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ جو لڑکی عرصے تک اس کے ساتھ ہنستی کھیلتی رہی ہو، شادی کے فوراً بعد متنفر ہونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ آخر احمد میں ایسی کون سی خرابی تھی جو اس خلیج کی بنیاد بنی؟ جہاں تک احمد کی حق گوئی کا سوال ہے اس سلسلے میں مجھے ذرا بھی شک و شبہ نہیں۔ جب ریحانہ اسے قریب پھٹکنے نہیں دیتی تھی تو اس کی جنسی نااہلی کیسے ظاہر ہوئی۔ مجھے اس کے ماضی کی باتیں یاد آنے لگیں۔ کوئی پانچ برس پہلے کی بات ہے۔ میں اس گاؤں میں Village Accountant کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ احمد میرے ماتحت کلرک تھا، نہایت سادہ لوح اور دیانت دار آدمی تھا۔ اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب میں ایک دن کسی کام سے جلد ہی گھر لوٹ آیا۔ کپڑے تبدیل کرتے وقت اچانک میرا ذہن دس ہزار کی اس گڈی کی طرف گیا جسے میں اپنے خیال میں دفتر سے اپنے ساتھ ہی لیتا آیا تھا۔ سارے کپڑے جھاڑنے کے باوجود گڈی نہیں ملی۔ دفتر کی رقم تھی، میں پریشان ہو گیا۔ دوبارہ کپڑے بدل کر دفتر جانے کی سوچ رہا تھا کہ احمد اندر داخل ہوا۔ اس نے جیب سے نوٹوں کی گڈی نکالی اور میرے حوالے کرتے ہوئے بتایا کہ میری میز پر فائیلوں کے درمیان ملی تھی۔ اس خیال سے کہ میں پریشان نہ ہو جاؤں اسے میرے حوالے کرنے چلا آیا۔ میں نے اطمینان کی سانس لی اور شکریہ ادا کیا تو کہنے لگا:

''شکریہ کی کیا بات ہے، میں نے تو اپنا فرض ادا کیا ہے۔''

دفتر کا عملہ اسے سنکی سمجھتا تھا کیونکہ آج تک اس نے کسی سے رشوت نہیں لی تھی۔ وہ رفتہ رفتہ میرے قریب آتا گیا۔ قربت اتنی بڑھی کہ اپنی ذاتی باتیں تک بتانے لگا۔ ایک دن بر سبیل تذکرہ اس نے بتایا کہ وہ دس برس کا تھا کہ ماں باپ کے سائے سے محروم ہو گیا، ایک دور کے رشتہ دار مخدوم صاحب کی سرپرستی میں پرورش پائی۔ اس کی خوبیوں سے واقف ہو کر مخدوم صاحب نے اسے اپنا داماد بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

احمد کو دفتر میں کام کرتے ہوئے دو ہی سال گزرے تھے کہ میرا تبادلہ شہر میں ہو گیا۔ اس کے چھ ماہ بعد اس کی شادی بھی ہو گئی جس میں، میں اور میری بیگم نے شرکت کر کے دونوں کو مبارکباد اور بہت ساری دعائیں دیں، پھر میں اپنی دفتری مصروفیات میں ایسا کھویا کہ عرصے تک احمد کا کوئی حال معلوم نہ ہو سکا۔ آج شادی کے دو سال بعد اس حال میں مجھ سے ملنے آیا تھا۔ اس نے جو باتیں بتائیں، سن کر میرا دل دکھ کے جذبات سے بھر گیا۔ ایک شریف اور نیک آدمی کی اس سے بڑھ کر اور کیا بدقسمتی ہو گی کہ اسے کسی دشمن سے نہیں اپنی منکوحہ بیوی سے ذہنی اذیت پہونچے۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ جلدی ہی گاؤں جا کر فریقین سے

PDF Compressor Free Version

ملوں گا اور مسئلہ سلجھانے کی کوشش کروں گا۔

چوتھے دن گاؤں پہونچ کر مخدوم صاحب سے ملا اور باتوں باتوں میں یہ خیال ظاہر کیا کہ ریحانہ کی اس بے رخی کی وجہ ممکن ہے اس کے دل میں کسی اور پسندیدہ ہستی کا وجود ہو اور وہ اپنا راز ظاہر کرنے سے ڈرتی ہو۔ آج کل ایسی مثالیں عام ہیں۔ یہ سن کر وہ بھڑک اٹھے، کہا:

''میری لڑکی کی تربیت دینی ماحول میں ہوئی ہے۔ دسویں کے بعد میں نے اسکول سے اٹھالیا تھا کیونکہ میں شروع ہی سے کالج کے آزاد ماحول سے نفرت کرتا ہوں، میری لڑکی نے تن تنہا کبھی گھر سے باہر قدم نہیں رکھا۔ ہمارے یہاں کوئی سنیما نہیں دیکھتا، نہ ہی ہمارے گھر میں ٹی۔ وی وغیرہ ہے۔ لازم تو یہ ہے کہ احمد خود اپنا طبی معائنہ کرائے۔''

میں نے انہیں بمشکل ٹھنڈا کیا:

''میں نے تو بس ایک خیال ظاہر کیا تھا، مگر جب ریحانہ بقول احمد کے اس کے قریب ہی نہیں پھٹکتی تو نااہلی کا الزام اور طبی معائنے کی بات بالکل بے وزن اور فرسودہ ہے۔''

اس دوران اچانک مجھے ایک ڈاکٹر دوست کا خیال آیا جو ذہنی امراض کے ماہر تھے۔ اس ناطے انہیں نفسیات میں بھی کافی دخل تھا۔ چنانچہ میں نے انہیں نہایت خلوص سے مشورہ دیا کہ ''ہم ریحانہ اور احمد کو ان سے ملا کر اس مسئلے کا حل تلاش کرنے کی کوشش کریں گے، لہٰذا آپ تینوں اگلے اتوار کو میرے گھر آجائیں۔''

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے، کے مصداق کچھ پس وپیش کے بعد وہ راضی ہوگئے۔ اتوار کو تینوں میرے گھر آئے، میں انہیں ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ پہلے تو انہوں نے تنہائی میں تفصیلات دریافت کیں، پھر مجھے باہر جانے اور ریحانہ کو اندر بھیجنے کا اشارہ کیا۔ اس وقت میرے تجسس نے جوش مارا تو میں کھڑکی کے سوراخ سے اندر جھانکنے لگا اور جو کچھ دیکھا اس سے بیقرار ہوا اٹھا۔ کمرے میں ریحانہ ڈاکٹر صاحب کی میز کی دوسری طرف سر جھکائے بیٹھی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کچھ دیر اس کے مشاغل اور اسکول کے دنوں کے بارے میں پوچھتے رہے، پھر بڑی خوبصورتی سے اصل مطلب کی طرف آئے۔

''بیٹی! مجھے بہت دکھ اور افسوس ہے کہ تمہارے ساتھ ایسا دھوکہ ہوا۔ احمد تو بظاہر بہت نیک اور شریف لڑکا معلوم ہوتا ہے۔''

جواب میں ریحانہ کے پاس ایک خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے سلسلہ کلام جاری رکھا:

''بیٹی! میں ایک باپ کی حیثیت سے تم سے پوچھ رہا ہوں۔ یقین کرو، میں تمہارا ہمدرد ہوں۔ جو کچھ کر رہا ہوں تمہارے بھلے کے لئے کر رہا ہوں اور پھر تمہارے مستقبل کا سوال ہے۔ یہ خاموشی تمہیں بہت مہنگی پڑے گی۔ تم نے زبان نہیں کھولی تو یقین کرو تمہاری زندگی جہنم بن جائے گی، لہٰذا مجھے سچی بات بتادو۔ ڈرو نہیں، آخر شادی کے فوراً بعد ہی اس سے کیوں نفرت ہوگئی تھی؟

''نہیں نہیں.....'' ریحانہ کے منہ سے بے اختیار نکل گیا:

''احمد بھیا اچھے آدمی ہیں مجھے ان سے نفرت نہیں ہے۔''

''احمد بھیا.....!'' ڈاکٹر صاحب چونک پڑے۔

''اپنے شوہر کے لئے تم ایسے الفاظ استعمال کر رہی ہو۔ آخر تم کیوں اسے شوہر قبول کرنے سے کترا رہی ہو جب کہ تم یہ بھی کہتی ہو کہ وہ اچھے آدمی ہیں۔''

''میں اب بھی کہتی ہوں کہ وہ اچھے آدمی ہیں۔'' پھر وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی:

''میں بچپن ہی سے انہیں بھیا کہتی آرہی ہوں۔'' ڈاکٹر صاحب کی آنکھوں میں ایک چمک سی ابھری:

''تو پھر تمہیں ان سے نفرت نہیں؟''

''نہیں.....''

ڈاکٹر صاحب چند لمحے کچھ سوچتے رہے، پھر ان کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ ابھری۔ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولے:

''اگرچہ تم نے میرے پہلے سوال کا جواب نہیں دیا، لیکن میں جواب پاچکا ہوں۔ اب میرا دل مطمئن ہے، اب تم جاسکتی ہو۔''

ریحانہ کی واپسی پر انہوں نے مجھے آواز دی اور بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولے:

''میرے دوست! یہ اپنی نوعیت کا بڑا دلچسپ کیس ہے۔ میں نے اندھیرے میں تیر چلایا تھا جو درست نشانے پر بیٹھا ہے۔ اب

PDF Compressor Free Version

مجھے کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ دونوں میاں بیوی کے درمیان کھنچی ہوئی خلیج کا راز جان چکا ہوں۔'' انہوں نے ریحانہ سے ہوئی گفتگو دہراتے ہوئے کہا:

''چونکہ ریحانہ کا کوئی بھائی نہیں تھا، لہٰذا اس کا دل پہلے ہی دن ایک بھائی کی محبت میں ڈوب گیا تھا، اب اسے اس گہرائی سے نکالنا ممکن نہیں۔ دراصل دونوں کے درمیان نفرت نہیں، بھائی بہن کی محبت حائل ہے اور اس کی مہک آج بھی ریحانہ کی باتوں سے اڑتی پھر رہی ہے۔ بچے بچپن میں جس رنگ میں رنگ جاتے ہیں سن بلوغ کو پہونچنے کے بعد بھی ان کے قلب و ذہن نفسیاتی طور پر اس رنگ سے آزاد نہیں ہو پاتے۔ معصوم لڑکی احمد کے ساتھ اس وقت سے رہتی آرہی ہے جب اسے جنس کی تمیز اور مرد و عورت کے تعلقات کا علم نہ تھا۔ سن بلوغ کو پہونچنے اور ان باتوں کا علم ہو جانے کے باوجود بھی احمد کے لئے اس کے جذبات و احساسات میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکی۔ علاوہ ازیں جس سنجیدہ اور دینی ماحول میں اس نے سانس لی ہے اس کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ دل کی بات زبان پر نہ لا سکے۔ جب لڑکی والوں کا ارادہ ابتدا ہی سے دونوں کو شادی کے بندھن میں باندھنے کا تھا تو لازم تھا کہ دونوں کو ایک دوسرے سے دور رکھتے یا کم از کم شادی سے قبل اس کی سہیلی کے ذریعہ لڑکی کی مرضی معلوم کر لیتے۔ شرعی احکام بھی یہی ہیں، مگر ہمارے معاشرے کا یہ زبردست المیہ ہے کہ لڑکی کی مرضی کو اہمیت نہیں دی جاتی۔ نتیجہ دیکھئے، ریحانہ اپنے منہ بولے بھیا کو شوہر کی حیثیت سے قبول کرنے سے عاجز ہے۔ مناسب یہی ہے کہ احمد سے طلاق لے کر اس کا نکاح کسی دوسری جگہ کر دیں اور احمد کے نکاح کے سلسلے میں بھی اس کی مدد کریں۔''

گھر لوٹ کر میں نے ساری گفتگو مخدوم صاحب اور احمد کو سنادی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ مخدوم صاحب کسی گہری نیند سے جاگے ہوں۔ ان کی زبان جیسے سل گئی تھی، انہوں نے بے چوں و چرا ڈاکٹر صاحب کا مشورہ قبول کر لیا اور گاؤں لوٹ گئے۔

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد میں اپنی بہن اور بہنوئی کی دعوت پر اپنی بیگم کے ساتھ شکاگو (امریکہ) چلا گیا، پھر کوئی دو برس بعد وطن لوٹا تو سفر کی تھکان دور کرنے میں کئی دن گزر گئے۔ ایک دن اچانک احمد کا خیال آیا اور میں اس کے بارے میں جاننے کے لئے بے چین ہو اٹھا۔ ایک اتوار کو گاؤں جا کر احمد سے ملا۔ وہ بہت خوش اور مطمئن تھا، اب اس کی صحت بھی لوٹ آئی تھی۔ وہ بہت تپاک اور گرم جوشی سے ملا اور بتایا کہ آرام سے کٹ رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے مخدوم صاحب کی رضامندی سے ریحانہ کو طلاق دے دی تھی۔ کچھ عرصہ بعد اس کے والدین نے اس کی شادی اپنے ہی کسی عزیز سے کر دی۔ اب وہ ایک بچے کی ماں ہے، اس کے چند دن بعد مخدوم صاحب نے میرا نکاح بھی ایک شریف گھرانے کی لڑکی سے کر دیا تھا، اب میرے یہاں ایک نئے مہمان کی آمد آمد ہے اور زندگی مزے میں کٹ رہی ہے۔ پھر اس نے خوشی کے آنسوؤں کے درمیان میرا ہاتھ تھام کر کہا:

''اگر آپ نے بروقت میری مدد نہ کی ہوتی تو یقیناً ہم دونوں کی زندگیاں اجیرن ہو جاتیں۔ ہمارے درمیان نفرت اور غلط فہمی کی 'خلیج' زندگی بھر نہ پاٹی جا سکتی، میں تو خودکشی تک سوچ چکا تھا۔'' ❁❁

قلم کار حضرات توجہ دیں

اپنی تخلیق کے ساتھ اپنا نام جو آپ کے بینک اکاؤنٹ میں ہے، انگریزی میں ضرور لکھیں، ساتھ ہی بینک کا نام و پتہ، اکاؤنٹ نمبر اور IFSC Code بھی تحریر کریں۔

اپنا موبائل نمبر اور مکمل پتہ بھی انگریزی میں تحریر کریں تاکہ آئندہ آپ کے معاوضے کی رقم سیدھے آپ کے اکاؤنٹ میں جمع کر دی جائے اور آپ کو دشواری نہ ہو۔

اس اعلان کو خاص طور پر وہ سبھی قلم کار بھی نوٹ فرمالیں جن کا کسی بھی طرح کے لین دین کا تعلق بہار اردو اکادمی سے ہے۔

—— سکریٹری

PDF Compressor Free Version

احمد کلیم فیض پوری

Shop No 6 Azad Market, Bhusawal, Maharashtra 425201

میں لوٹ آؤں گی کل

سری نگر کے لال چوک میں پھر بم پھٹا تھا۔

گاندربل جانے والی بس کا کنڈکٹر خاموش تھا، ورنہ گاندربل جانے والی سواریاں اس مانوسی آواز پر کھنچی چلی آئی تھیں، حادثہ میں چار افراد ہلاک ہو چکے تھے اور کئی زخمی۔ کرفیو لگا دیا گیا تھا۔ راستے سنسان تھے ساری دکانیں بند تھیں، خوف زدہ لوگوں نے اپنے گھروں کے دروازے اور کھڑکیاں بند کر رکھی تھیں۔ ایسے واقعات یہاں اکثر ہوا کرتے تھے۔ لوگ عادی ہو چکے تھے۔ یہ کام دہشت پسندوں کا تھا۔ ان کے خیال میں وہ اپنے حق کی لڑائی لڑ رہے تھے یوں تو حق کی لڑائی نکسل وادیوں کا بھی مقصد تھا، لیکن وہ کم ہی چرچا میں رہتے تھے۔ دہشت وادی ہوں یا نکسل وادی انسانی زندگی کے درہم برہم ہو جانے کی انہیں کوئی فکر نہیں تھی۔

چاروں طرف پھیلے سناٹے میں ایک مکان ایسا تھا جس کی اوپری منزل کی کھڑکی ذرا دیر تو کھلتی اور فوراً بند ہو جایا کرتی، نیچے چوک کا وسیع علاقہ پولیس اور CRPF کے مسلح جوانوں کی سخت نگرانی میں تھا۔ اگرچہ وہ گھر گھر تلاشی لے چکے تھے اور کئی بے قصور لوگوں کو حراست میں لے چکے تھے، پھر بھی گھروں کی طرف اپنی سنگینیں تانے کھڑے تھے۔ آئے دن کے یہ واقعات وادی کا مقدر بن چکے تھے۔

کھڑکی ذرا دیر کو پھر کھلی، باہر جھانکنے والا شخص خاصہ بے چین دکھائی دے رہا تھا۔ وہ جب بھی کھڑکی کھولتا جوان تعینات دکھائی دیتے، اگر کھڑکی زیادہ دیر کھلی رکھتا تو اندیشہ تھا کہ کہیں گولی کا نشانہ نہ بنا دیا جائے۔

اس مرتبہ کرفیو کی میعاد کافی طول کھینچ چکی تھی، آج کرفیو کا پانچواں دن تھا۔ اس دوران کرفیو کو ڈھیل نہیں دی گئی تھی۔ بات یہ تھی کہ اس کی بیوی کو نو مہینے اور کچھ دن اوپر ہو چکے تھے وہ بچہ جننے کو تڑپ رہی تھی پیٹ کا درد پنڈلیوں ہی اتر آیا تھا، جس کی وجہ سے وہ بے حال سی ہو گئی تھی۔ پسینے میں شرابور تھی۔ وہ شخص ایک لمحہ کو باہر دیکھتا پھر اپنی بیوی کے پلنگ کے پاس آ جاتا۔ جہاں وہ چت لیٹی درد زہ میں مبتلا تھی اس کا حسین و خوبصورت چہرہ کمھلا گیا تھا۔ گلابی آنکھیں بے نور سی دکھائی دے رہی تھیں۔ سہ پہر ہونے تک آدمی کئی چکر لگا چکا تھا، ہر لمحہ اسے تراش کئے دے رہا تھا۔ اسی وقت بیوی کے کراہنے کی آواز سے دو چھوٹے بچے بری طرح سہم گئے تھے جو ماں کے سرہانے بیٹھے بلبلا رہے تھے۔ ماں اپنے کرب سے جوجھ رہی تھی۔ وہ بیوی کو اسپتال کیسے لے جاتا، کس سے مدد مانگتا، کرفیو کی حالت میں سواری کا ملنا محال تھا۔ آخر ہمت کر کے وہ نیچے اترا پولس سے مدد کی گہار لگائی، مگر اس کی کوئی سنوائی نہیں ہوئی۔ پولس کے دل میں ذرا رحم نہ آیا۔

آخر بیوی نے زور کی چیخ ماری اسی وقت نوزائیدہ بچے کے رونے کی آواز سنائی دی، وہ فارغ ہو چکی تھی اور قبل اس کے کہ شوہر پہنچ پاتا، اس نے آخری ہچکی لی اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔

لال چوک شام کے ملگجے اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ چاروں طرف گہرا سکوت تھا۔ پولس کے سپاہی جا بجا تعینات تھے، پڑوسیوں نے کسی طرح رابطہ قائم کیا۔ وائرلیس سے خبر گئی تب تجہیز و تدفین کی اجازت ملی۔ جنازے میں صرف دس ہی افراد شریک ہو سکتے تھے اور جب میت کو قبرستان لے جایا جا رہا تھا، پولس کے 30-35 جوان دائفلیں تانے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ گویا وہ کسی دہشت گرد کی لاش لئے جا رہے ہوں۔

قبرستان سے لوٹنے کا منظر بھی کچھ اسی طرح کا تھا، جنازے میں شریک لوگوں کو پولس اپنے گھیرے میں لئے چل رہی تھی۔ شوہر نے دل ہی دل میں گالی دی۔

''سالے'' اور بے حد رنجیدہ ہو کر سوچا، یہ کیسی ستم گری تھی،

PDF Compressor Free Version

میت کے لئے کاندھے مہیا کئے مریض کو اسپتال کا منھ نہیں دکھایا۔ کفن کے لئے چادر کا انتظام کیا بچوں کے لئے ماں کا آنچل مہیا نہیں کیا۔ یہ کیسے رات دن ہیں جن میں بربریت کی داستان لکھنا معمول بن گیا ہے۔ سوچتے سوچتے گھر آ گیا۔ میت کا وہ گھر جس کی طرف اب بھی راتفلیں تنی ہوئی تھیں۔

رات کے گیارہ بجے قبرستان سے لوٹ کے آئے لوگ اپنے گھروں میں داخل ہوئے تھے کہ دوگرینیڈ آ کر گرے، پولس کا ایک جوان مارا گیا اور کئی زخمی ہوئے بے تحاشہ پولس فائرنگ میں حملہ آوروں کا کیا ہوا یہ معلوم نہیں ہو سکا، البتہ کئی گھروں کی کھڑکیوں کے شیشے چکنا چور اور سائبانوں کے ٹین گولیوں کی بوچھار سے چھلنی دکھائی دے رہے تھے۔

کبھی لال چوک کیسا بارونق دکھائی دیتا تھا۔ اسکول جانے والے بچے غول در غول گزرتے تھے۔ دکان دار اپنی دکانوں میں بچوں کے لئے روزی تلاش کیا کرتے۔ مائیں سودا لینے پہنچ جاتیں، گوالوں اور اخبار والوں کی دوڑ دھوپ رہا کرتی۔ موٹر گاڑیوں کی ریل پیل ہوا کرتی، گاندربل کے بس کنڈکٹر کی مانوس آواز کانوں میں گونجتی، مگر اب سب کچھ بدل چکا تھا۔ ہری ہری گھاس پر دھوپ کا پہرہ تھا۔

ایک لال چوک ہی کیا چاروں طرف ستاروں کے منحوس سائے سے اکتائے تھے ڈل کا شفاف پانی میلا ہو گیا تھا۔ چنار کے درخت خود اپنی آگ میں جھلس رہے تھے۔ پہاڑوں کی برف پگھل کے مٹی کی نالیوں میں جمنے لگی تھی۔ نشاط اور شالمار گرد و غبار سے اٹے دکھائی دینے لگے تھے۔ لشکارے اور ہاؤس بوٹ اوندھے پڑے تھے، شیو کے مندر میں گھنٹیوں کی آواز اور درگاہ حضرت بل سے اٹھی دعاؤں کی صدا سسکتی سی محسوس ہونے لگی تھی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ کل کا سورج کیا روپ لے کر آئے گا۔

''گل آج دھاکہ کیوں نہ ہوا.....؟'' انیتا نے کچھ حیرت اور معصومیت سے پوچھا۔ اس کی آنکھوں میں تجسس کی لکیریں تھیں۔

''تمہاری سالگرہ ہے نا! اس لئے۔''

''ابھی کچھ دن پہلے جو بچے مارے گئے ہیں، ان کی بھی تو سالگرہ رہی ہوگی؟''

''ہاں''

''اچھا یہ بتاؤ یہ آتنگ وادی آتے کہاں سے ہیں؟''

''سنا ہے کانٹے دار جگہ سے، جو یہاں سے کافی دور ہے۔''

''کیا وہاں کوئی پہرہ لگا ہوا نہیں ہے؟''

''لگا ہے، لیکن میلوں دور پھیلے علاقے پر نظر رکھنا آسان نہیں۔''

''پہرہ کیوں نہیں بڑھا دیا جاتا۔''

گل کچھ عاجز سا دکھائی دیا۔ سمجھاتے ہوئے کہنے لگا:

''دیکھو انیتا یہ بہت گہری باتیں ہیں، تمہاری ہماری سمجھ سے پرے کی، جتنا ہمارے بڑے گفتگو کرتے ہیں اس کا آدھا ادھورا ہماری سمجھ میں آتا ہے، پھر اس نے موضوع بدلتے ہوئے مسرت آمیز لہجہ میں کہا:

''دیکھو کتنے اچھے کنگن ہیں، سنہرے، چمک دار سے ڈل گیٹ کی دکان سے خریدے ہیں، تمہارے ہاتھوں میں خوب جچیں گے۔''

گل نے پیکنگ کھول دیا۔ سونے جیسے کنگن تھے، دیکھ کر انیتا کا دل خوشی سے بھر گیا اس نے جھٹ کنگن اپنے ہاتھوں میں پہن لئے اپنے ہاتھ گل کی آنکھوں تک لا کر ہلانے لگی، پھر اس نے تعریفی نگاہوں سے گل کی طرف دیکھا اور اس کا شکریہ ادا کیا۔

''اس میں شکریے کی کیا بات ہے؟'' گل نے محبت کی ایک نظر انیتا کے چہرے پر ڈالی اور جذباتی ہو کر کہنے لگا:

''کیا تمہاری طرح میری ایک بہن نہیں ہے، جتنا پیار اس سے کرتا ہوں اس سے کہیں زیادہ چاہتا ہوں میں تمہیں۔'' وہ ہنس دی۔ انیتا کی ہنسی میں بلا کی کھنک تھی۔

نام تو اس کا غلام محمد تھا، لیکن پیار سے سبھی اسے گل کہا کرتے تھے۔ گلاب ایسا خوبصورت چہرہ، چوڑی پیشانی، سنہرے بال کھڑی ناک، انیتا اس کے پڑوس میں رہتی تھی۔ گوری گوری چمک دار آنکھوں والی لڑکی بولتی تو جیسے نقرئی گھنٹیاں سی بج اٹھتیں۔ چھٹی ساتویں کے یہ دونوں طالب علم ہم عمر تھے۔ گل مشکل سے ایک برس بڑا تھا۔ ساتھ ساتھ اسکول جاتے، ساتھ پڑھائی کرتے، دونوں میں گہری دوستی تھی، ان کے بے پناہ آپسی لگاؤ نے دونوں گھروں کو ایک دوسرے سے بے حد قریب کر دیا تھا عید دیوالی میں وہ ایک روپ دکھائی دیتے تھے۔

PDF Compressor Free Version

انیتا کا باپ پنڈت تھا، اناج کا بڑا بیوپاری، شہر میں اس کی بڑی عزت تھی، انیتا اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی، جو بابا پیام الدین رشی سے مانگی مرادوں کے نتیجہ میں پیدا ہوئی تھی، انیتا کی ماں نے کئی جمعراتوں تک آستانہ پر حاضری دی تھی اور بابا کے ہاتھ کے بنائے ہوئے متبرک چولہے کی لیپا پوتی کی تھی، آخر شادی کے سات سالوں بعد انیتا کی ماں کی گود ہری ہوئی تھی۔

غلام محمد کا باپ دو ہاؤس بوٹ کا مالک تھا۔ اگر چہ ان دنوں کاروبار مندا تھا لیکن کھیتی باڑی کی کچھ آمدنی گھر آجاتی تھی۔ گل کے نیچے اوپر کل پانچ بھائی اور بہن تھیں۔ متوسط درجے کا یہ پریوار خوش حال تھا۔

چھٹی کا دن تھا۔ انیتا اور گل اپنے گھروں سے دور ایک ہرے بھرے میدان میں کھیل رہے تھے۔ تھک گئے تو چنار کے ایک گھنے درخت کے نیچے آبیٹھے تھے۔ انیتا یکا یک مغموم سی ہوگئی۔ وادی کے بگڑے حالات کا ذکر گھر میں ہوا کرتا تھا۔ اس کی سمجھ میں بالکل نہ آتا تھا، اسی لئے آج وہ فکر مندی کے ساتھ گل سے پوچھ رہی تھی کہ ایسا کیوں ہے۔ یہ آتنک واد، بم کے دھماکے یہ افراتفری کیوں اور پھر کرفیو میں زندگی جام بن کر رہ جاتی ہے کئی کئی دنوں بچے اسکول نہیں جا پاتے۔ دودھ، پاؤ اور سبزی کی شدید قلت ہوجاتی ہے۔ گل نے اسے سمجھانے کی کوشش ضرور کی تھی، لیکن وہ مطمئن نہ ہوسکی تھی۔ کبھی کبھار ماں سے پوچھتی مگر وہ اکثر ٹال جایا کرتی۔

آج انیتا کی سالگرہ تھی۔ گل چاہتا تھا کہ گھر جا کر تحفہ پیش کرے، مگر اس سے صبر نہ ہوسکا، اپنے لبے کرتے میں تحفہ چھپا کر لایا تھا، انیتا بھی ایسی اتاولی کہ دیکھتے ہی کنگن پہن لئے تھے اور جب سورج چنار کے سر پر آگیا تو دونوں اپنے گھروں کو چل دئے۔

شہر میں سنسنی پھیل گئی تھی، جن پنڈتوں نے وادی چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا تھا ان میں انیتا کا گھر بھی تھا۔

ایک بڑی پنچایت بلائی گئی۔ شہر کے علاوہ دور دراز گاؤں دیہات کے پنڈت اکٹھا ہوئے۔ سب کا یہ کہنا تھا کہ ہم یہاں محفوظ نہیں ہیں، کبھی بھی کسی وقت بھی جان کو خطرہ لاحق ہے، پس ہجرت کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ کار نہیں ہے، لیکن کچھ بڑے بوڑھے متفق نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا ہم یہاں کئی نسلوں سے باہمی یگانگت کے ساتھ رہ رہے ہیں، کوئی آپسی تنازعہ نہیں، شکوہ شکایت نہیں، اگر چند سر پھرے وادی کے امن وسکون میں زہر گھولنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہاں رہنے والے تمام شہریوں کو قصوروار نہیں سمجھا جاسکتا اور پھر ہماری راکھ تو اسی مٹی میں ملنا ہے، مگر جذبات سے مغلوب کچھ لوگوں نے اور جوشیلے نوجوانوں نے بزرگوں کی چلنے نہ دی، آخر طے پایا کہ اپنا کاروبار جلد سے جلد سمیٹ لیا جائے اور آنے والی درگا پوجا تک ہجرت کر جائیں۔

پنڈت اچھی طرح جانتے تھے کے یہ لڑائی براہ راست ان سے نہیں ہے، جبر کی قوتوں کے ساتھ ہے جو ان کے نصب العین کی جڑ کاٹنے کے درپے ہیں، پھر بھی وہ خطرہ محسوس کرتے تھے کہ آتنک واد کا رخ کہیں ان کی طرف نہ بڑھ جائے، جس کا اشارہ ان کے سیاسی پنڈت بھی انہیں دیا کرتے تھے۔ چنانچہ مال اور جائیداد سے زیادہ اپنی جانوں کی فکر لاحق تھی، اسی لئے ہجرت کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھے ہوئے تھے۔

انسانی تاریخ کبھی معمولی واقعات سے شکست بھی کھا جاتی ہے۔ وادی سے ہجرت بھی اسی شکست خوردہ تاریخ کا ایک باب تھی، جانے والوں نے بالآخر اپنے جانے کا سامان کر ہی لیا تھا، گل کے باپ نے انیتا کے باپ کو ازراہ ہمدردی سمجھایا تھا۔ اپنی دوستی اور محبت کا واسطہ دیا تھا، لیکن ان کی آنکھوں میں تیرتے آنسو گواہی دے رہے تھے کہ چاہے کچھ ہو، انہیں اپنے ہم مذہبوں سے وفا کرنی تھی۔

ایک دن انیتا اور گل چنار کے اسی پیڑ کے نیچے ملے۔ انیتا نے اپنے گھر والوں کے فیصلہ سے آگاہ کرتے ہوئے رقت آمیز لہجہ میں کہا:

''یہ شہر چھوڑ کر جارہے ہیں، کہاں؟ اس کا علم مجھے نہیں ہے۔ ہم ایک دوسرے سے بچھڑ جائیں گے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔'' پھر اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے گل کی طرف دیکھا اور بولی:

''گل، میرے بھیا مجھے بھول نہ جانا۔''

پھر وہ بے تحاشہ رو پڑی، گل نے اپنے رومال سے اس کے آنسو پونچھے اگر چہ اس کی آنکھوں میں بھی آنسوؤں کی بوندیں چمک رہی تھیں، لیکن وہ ضبط کئے ہوئے تھا۔ انیتا کو دلاسہ دے رہا تھا جب کہ اس کی زبان سے نکلے ہوئے لفظ دلاسے کے مفہوم سے عاری تھے۔

PDF Compressor Free Version

اس کے دل پر جو بیت رہی تھی اس حالت میں خود وہ چاہ رہا تھا کہ اسے کوئی دلاسہ دے۔ وہ بمشکل کہہ پایا:

''میں تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں بہنا! تو میرے دل میں روح کی طرح پیوست ہے۔ جب تو دلہن بنے گی، تیری ڈولی اٹھانے ضرور آؤں گا۔'' اور پھر وہ بے ساختہ رو پڑا۔

رات کے دس بجے خبر آئی کہ انیتا کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی ہے۔ اسے بہت تیز بخار ہے۔ بری طرح بڑبڑا رہی ہے، کہہ رہی ہے کون مجھے گھر سے نکالنے آیا ہے۔ میں نہیں جاؤں گی، ماں وہ کون ہے اس سے کہو میں نہیں جاؤں گی، یہیں رہوں گی، پھر وہ زور سے چلائی پکڑو مجھے ممی! اس کے بعد اس پر غشی طاری ہوگئی۔

گل کا سارا گھر اسپتال پہنچ گیا۔ انیتا آنکھیں موندے بستر پر پڑی ہوئی تھی، گل آہستگی سے پلنگ کے کنارے جا بیٹھا، انیتا کی پیشانی پر ہاتھ رکھا، بہت تیز بخار تھا۔ وہ بے چین ہو اٹھا۔ انیتا کو پکارنا چاہتا تھا، لیکن وہ بے ہوشی کے عالم میں بے حس و حرکت پڑی تھی۔ سانس برابر چل رہی تھی۔ اسی وقت نرس آ پہنچی اور سب کو روم سے باہر نکال دیا۔

پانچ دنوں تک انیتا کا بخار نہیں اترا۔ سب پریشان تھے۔ گل نے کھانا پینا ترک کر دیا تھا۔ بے حد اصرار پر صرف ایک کپ دودھ لے لیا کرتا، انیتا کی صحت کے لئے دعائیں مانگی جا رہی تھیں، گل کی ماں نے وہیں Reception Room میں قرآن مجید کی تلاوت شروع کر دی تھی۔ انیتا کے باپ اور ماں کے چہرے اترے پڑے تھے۔ آج چھٹے دن انیتا کو ہوش آیا اس وقت گل اس کے سامنے تھا۔ سب کے چہرے خوشی سے کھلے ہوئے تھے۔ انیتا کو اسپتال سے چھٹی دے دی گئی تھی۔

لاری پر سامان لادا جا رہا تھا۔ یہ منظر گل اور اس کے گھر والوں کے لئے بڑا ہی کربناک تھا۔ کیا کریں، نیتی کو یہی منظور تھا۔ سامان لد چکا تو دونوں گھروں کے لوگ شدت غم سے رونے لگے، پڑوسیوں کی آنکھیں بھی نم تھیں۔ انیتا گل کے پاس خاموش کھڑی تھی۔ چہرہ کملایا ہوا تھا۔ آنکھوں میں کوئی چمک نہیں تھی۔ اس نے اچٹتی سی نگاہ گل کے چہرے پر ڈالی اور ٹرک کے پچھلے حصہ میں جا بیٹھی، جو سامان سے لدا ہوا تھا۔ انیتا کی ماں بھی وہیں بیٹھی ہوئی تھی۔ سب نے بھاری من سے انہیں الوداع کہا۔

ٹرک چل پڑا۔ اچانک گل اس کے پیچھے دوڑتا چلا گیا۔ ماں باپ کے منع کرنے کا اس پر کوئی اثر نہ پڑا۔ دوڑتے دوڑتے اس کی چیخ بلند ہوئی، انیتا کی طرف نظریں گاڑے ہوئے اس نے زور سے چلا کر کہا:

''انیتا مت جاؤ، رک جاؤ انیتا.....'' وہ دوڑتا رہا، چلاتا رہا اور ٹرک جموں شاہراہ پر اپنی رفتار سے آگے بڑھتا چلا گیا۔

انیتا کے من میں ایک ہوک سی اٹھی۔ گل کے چہرے پر مایوسانہ نظر ڈالی اور دفعتاً چیخ پڑی:

''گل میں لوٹ آؤں گی..... جلد ہی لوٹ آؤں گی..... اپنی دھرتی کی طرف۔''

گل بری طرح ہانپنے لگا تھا۔ دوڑتے دوڑتے اس کے پیر جواب دینے لگے تھے۔ آخر لڑکھڑا کر نیچے گر گیا۔

انیتا دور بہت دور جا چکی تھی۔

اگلے دن لال چوک میں بم پھٹا تھا کرفیو لگا دیا گیا تھا۔ ہر طرف گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔ لوگ اپنے گھروں میں بند تھے۔ نہیں معلوم آج بھی کوئی گھر ایسا ہو جہاں دردزہ میں مبتلا کسی خاتون نے زندگی کی آخری سانس لی ہو، گاندربل جانے والی بس کا کنڈکٹر خاموش تھا۔

❁❁❁

راسخ عظیم آبادی کا رنگ تصوف (ص ۲۴ سے آگے)

ہونے کی بات ہو یا افتادگی میں رفعت و بلندی کی، ترک لذت دنیا کی بات ہو یا تمام عالم اور اس کے ذرے ذرے سے ذات مطلق کے ظہور کی، راسخ نے آخر کار اپنی بیاض کے صفحات پر تخلیقی ہنرمندی سے جو نقوش ابھارے ہیں، ان میں تازگی بھی ہے اور وارفتہ کر دینے کی قوت بھی۔ یہ شعر ملاحظہ کیجئے اور راسخ کی فکری بلندی کی داد دیجئے۔

کوئی در پردہ کارفرما ہے
ڈھب سے اس کارگہ کے پیدا ہے

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

منظومات

شنکر کیموری

Programme Executive , All India Radio, Patna

حمد پاک

جلتا سورج ، چاند ، ستارے سب کا مالک اللہ ہے
چنچل موجیں ، دونوں کنارے سب کا مالک اللہ ہے

کالی گھٹائیں ، مست ہوائیں ، آتا جاتا یہ موسم
چڑیوں کی آواز سہانی ، پھولوں کے گالوں پر شبنم
میری نظر ، رنگین نظارے سب کا مالک اللہ ہے

مالک ہے وہ اس دھرتی کا ، مالک ہے کھساروں کا
کر کے مطالعہ دیکھ چکے ہیں ہم قرآن کے پاروں کا
میرے سپنے خواب تمہارے سب کا مالک اللہ ہے

دل کی دھڑکن ، سانس کی ڈوری ، جسم کے اندر لال لہو
ہر ذرہ ، ہر قطرہ بولے اللہ اللہ ، اللہ ہو
کہتا پربت باہیں پسارے سب کا مالک اللہ ہے

گہرا سمندر ، زورِ طوفاں ، بوئے گل اور بادِ صبا
شنکر سب کو کرتے دیکھا اپنے خدا کی حمد و ثنا
راجا ہو یا ہوں بنجارے سب کا مالک اللہ ہے

❁❁❁

نعت شریف

وہی اک شکل نورانی ، یہاں بھی ہے وہاں بھی ہے
جمالِ حسن یزدانی ، یہاں بھی ہے وہاں بھی ہے
شب معراج حوروں سے کہا جبرئیل نے دیکھو
میرے آقا کی سلطانی ، یہاں بھی ہے وہاں بھی ہے
خدایا دونوں تیرے ہیں ، وہ کعبہ ہو کہ طیبہ ہو
تیرے جلوؤں کی تابانی ، یہاں بھی ہے وہاں بھی ہے
جو حب مصطفےٰ میں ہر گھڑی سرشار رہتے ہیں
انہیں ہر شئے کی آسانی ، یہاں بھی ہے وہاں بھی ہے
خدا ہے عرش پر ، سرکار ہیں میرے مدینے میں
مگر اک شان رحمانی ، یہاں بھی ہے وہاں بھی ہے
جو منکر ہے مرے سرکار کی شانِ رسالت کا
تو پھر اس کو پریشانی ، یہاں بھی ہے وہاں بھی ہے
سر محشر وہ اپنے عاصیوں کو بخشوائیں گے
یہ امت کی نگہبانی ، یہاں بھی ہے وہاں بھی ہے
کلام اللہ کا اترا ہے شنکر آسمانوں سے
وہی آیات قرآنی ، یہاں بھی ہے وہاں بھی ہے

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

شہپر رسول

Dept. of Urdu, Jamia Millia Islamia, Jamia Nagar, New Delhi 110025

غزلیں

میرے لمحوں کو بناتا ہے جو صدیوں کی کہانی کون ہے
مجھ میں مجھ سے ماورا شہپر وہ میرا یارِ جانی کون ہے

میں تو اُن کا نام بھی اپنی زباں پر لا نہیں سکتا ، مگر
پھر بھی وہ پوچھیں گے یہ جو کر رہا ہے لن ترانی کون ہے

اپنے اجداد و سلف کی عظمتوں میں جیسے کھو جاتے ہیں سب
سہ دری میں بیٹھ کر کرتا ہے جو باتیں پرانی کون ہے

میں ہوں اور میرا جنوں ہے ، ماسوا کی کچھ خبر مجھ کو نہیں
کون دریا پار کر کے آ گیا ہے ، پانی پانی کون ہے

کر رہے ہیں پھر غزل کو اک نئے رستے پہ لے آنے کی بات
کون ہے ان میں خلیلؔ و ناصرؔ و انشاؔ و بانیؔ کون ہے

ہم تو اپنی داستاں کا نصف اوّل لکھتے لکھتے سو گئے
شہپرؔ اتنا خوبصورت لکھ گیا جو نصف ثانی کون ہے

❁❁❁

ایک دن نہ رونے کا فیصلہ کیا میں نے
اور پھر بدل ڈالا اپنا فیصلہ میں نے

دل میں ولولہ سا کچھ ، چال میں اَنا سی کچھ
جیسے خود نکالا ہو اپنا راستہ میں نے

مجھ میں اپنی ہی صورت دیکھنے لگے ہیں سب
جانے کب بنا ڈالا خود کو آئینہ میں نے

اُس کو بھی تھا کچھ کہنا، مجھ کو بھی تھا کچھ سننا
اور کچھ کہا اُس نے اور کچھ سنا میں نے

کچھ خبر نہ تھی مجھ کو کھل رہا ہے کوئی گل
بس ہوا کا آئینہ دیکھ ہی لیا میں نے

وقت نے ہر آہٹ پر خاک ڈال دی شہپرؔ
کر دیا ادا آخر جزیۂ اَنا میں نے

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

راشد طرآز

"Obaid Manzil" Dilawarpur, Munger 811201

غزلیں

جذبات کا اپنے یہاں سر کاٹ رہا ہے
یہ کیسی سزا آج بشر کاٹ رہا ہے

آشوبِ مسافت تو نہیں گردشِ ہستی
پھر کیا ہے کہ ہر شخص سفر کاٹ رہا ہے

دیوار اُٹھا دی ہے یہاں بازیگروں نے
اَور مجھ کو یہ تقسیم کا گھر کاٹ رہا ہے

زہراب مجھے دینے میں چوکس رہی دنیا
یہ میرا جگر ہے جو اثر کاٹ رہا ہے

یہ درد ، یہ احساس کی شدت، یہ تمازت
دل میرا بھی کیا فصل ہنر کاٹ رہا ہے

اک محشر احساس ہے چھایا ہوا ، جس کو
ہمزاد مرا شام و سحر کاٹ رہا ہے

خوابوں کا امیں بن کے مری رات میں راشدؔ
اتنا تو ہے وہ تارِ نظر کاٹ رہا ہے

❁❁❁

سمجھ کے آئینہ اکثر پکارتا ہے مجھے
یہ کم نہیں کوئی پتھر پکارتا ہے مجھے

چلو کہ بوسۂ منزل سے تشنگی ہے قریب
سنا ہے کوئی سمندر پکارتا ہے مجھے

وجود میرا مکمل ضرور ہوگا وہاں
جہاں سے فرض کا محور پکارتا ہے مجھے

میں بھول آیا تھا جس کو سکوں پسندی میں
وہ اضطراب کا پیکر پکارتا ہے مجھے

مری خموشی اسے قابل قبول نہیں
اسی لئے مرا محشر پکارتا ہے مجھے

وجود کر دیا جب اپنا مسترد میں نے
تو اعتماد کا منظر پکارتا ہے مجھے

طرآز اپنی بغاوت کی روشنی کی قسم
ابھی بھی شہر ستمگر پکارتا ہے مجھے

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

شمیم قاسمی

Sector D, Sher Shah Street, New Azimabad Colony, Patna 800006

غزلیں

(شمس الرحمٰن فاروقی☆ کی نذر)

وہ حادثے جو نگاہوں سے دور ہوتے ہیں
مرے خیال کا مرکز ضرور ہوتے ہیں

جو اپنے عہد کا گہرا شعور رکھتے ہیں
سخن سفر میں وہی باشعور ہوتے ہیں

سجا کے ان کو کہاں شہر سنگ میں رکھئے
ذرا سی ٹھیس سے شیشے جو چور ہوتے ہیں

ادائے معنی میں جوہر انہیں کے کھلتے ہیں
کہ بطن شعر میں جتنے فتور ہوتے ہیں

کسی کی رات کو ہم رائیگاں نہیں کرتے
الگ یہ بات کہ نشے میں چور ہوتے ہیں

تمہارے لہجے میں جتنی کھٹاس ہے پیارے
اب اتنے کھٹے کہاں آمچور ہوتے ہیں

ہوا سے پہلے پہنچتے ہیں شہر دل میں شمیم
الٰہ آباد کہ ہم کانپور ہوتے ہیں

☆ مذاق سب کا جدا ہے سخن تو ایک ہے
رند وہی سمجھتے ہیں جو باشعور ہوتے ہیں

❁❁❁

بار تم بھی اٹھاؤ سانسوں کا
ہو نہ جائے جماؤ سانسوں کا

تخلیہ میں تو گل سخن نکلا!
چوک پر مول بھاؤ سانسوں کا

جان آیا ہے خاص خلوت میں
دیدنی ہے سجاؤ سانسوں کا

زندگی اب پناہ مانگے گی
آگیا اُوبلاؤ سانسوں کا

دیکھ کر لوٹنا ہے رقص بدن!
کون دیکھے گا گھاؤ سانسوں کا

اس لئے تو رواں دواں ہے سفر
ہے سرا زیر ناؤ سانسوں کا

تھم گئی کائنات چلتے ہوئے
ہوگیا ''چل چلاؤ'' سانسوں کا

کچھ ہوئی بات موسم گل کی
کچھ ہوا کم تناؤ سانسوں کا

میں کہ زندہ بہ شکل مردہ ہوں
پھر بھی رشتہ نبھاؤ سانسوں کا

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

پروفیسر شاداب رضی

Deptt. of Urdu, T.M.Bhagalpur University, Bhagalpur 812007

غزلیں

آپ کی ذات ، ذات پھولوں کی
آپ میں سب صفات پھولوں کی

پھول جھڑتے ہیں پھول سے لب سے
پھول سی بات ، بات پھولوں کی

آپ جب تک رہے خیالوں میں
ہر طرف تھی برات پھولوں کی

عمر کی وہ بھی ایک منزل تھی
ہر طرف تھی قنات پھولوں کی

پھول کا رنگ ، پھول کی خوشبو
ہے یہی کائنات پھولوں کی

یہ دہکتی ہوئی دھنک جیسے
ایک سوغات سات پھولوں کی

یہ ستارے ، یہ کہکشاں شاداب
رات ہے یا نبات پھولوں کی

❁❁❁

شام تنہا کٹی ، سحر تنہا
ہم نے یوں طے کیا سفر تنہا

ایک پیکر تھا ایک پرچھائیں
ایک لمبی سی رہ گزر تنہا

دن تو جوں توں گزار لیتے ہیں
رات کٹتی نہیں مگر تنہا

کون بانٹے اداسیاں کس کی
ہم اِدھر اور وہ اُدھر تنہا

آنسوؤں کا عذاب سہنا ہے
اور جلنا ہے طاق پر تنہا

سرد یادوں کی تیز بارش میں
بھیگتا ہے کوئی کھنڈر تنہا

جب لرزتی ہے لو چراغوں کی
کانپتی ہے مری نظر تنہا

سوچتے سوچتے لگا جیسے
تم کھڑے ہو قریب تر تنہا

جانے کیا کیا نہ کیفیت گزرے
وہ کبھی مل گیا اگر تنہا

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

سلیم انصاری

IIIG-3, Anand Nagar, Adhartal Jabalpur (M.P.)

غزلیں

ہے اگر مجھ میں رائیگاں مٹی
تو مجھے کردے بے نشاں مٹی

خاک سے خاک تک سفر میرا
اور کیا میری داستاں مٹی

جھیلنا ہے عذابِ دَر بدری
ہے ابھی مجھ سے بد گماں مٹی

اور کب تک شکست لفظ و خیال
اور کب تک مرا زیاں مٹی

کاش لوٹ آئے پھر مسافر دل
منتظر ہے سرائے جاں مٹی

اک ترے لمس کی کرامت سے
ہو گئی مجھ میں ضو فشاں مٹی

❁❁❁

میں ازل سے ہوں اسیر خدوخال
میرے آزر مجھ کو پتھر سے نکال

کھو چکے بینائی سب لفظ و خیال
اب غزل ہے صرف لہجے کا کمال

کھو گیا سارا اثاثہ راہ میں
میرے گھر مجھ سے نہ کر کوئی سوال

پھر کریدو اور نمک پاشی کرو
ہے یہی زخموں کا میرے اندمال

ہے تجھے گر اپنے چہرے کی تلاش
پہلے خود کو آئینہ گھر سے نکال

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

کتابوں کی دنیا

نام کتاب	:	شاعر گمنام
مرتب وناشر	:	ابونصر فاروق صارم عظیم آبادی
اشاعت	:	۲۰۱۵ء
صفحات	:	۳۲۰
قیمت	:	۱۷۳ روپے
مبصر	:	زبیر احمد بھاگلپوری

''شاعر گمنام'' پیامی عظیم آبادی کی غزلوں اور نظموں کا قریب التلف ۲۰۱۵ء میں شائع وہ مجموعہ ہے جسے ان کے فرزند ارجمند ابونصر فاروق صارم عظیم آبادی نے وقت بسیار کے بعد قومی اردو کونسل کے جزوی مالی تعاون سے منظر عام پر لایا ہے۔ طاق نسیاں میں اس دفینۂ سخن کی بالتاخیر اشاعت مولف کے لئے تو قابل مبارک باد ہے، لیکن باعث استعجاب بھی، اسے بہت پہلے زیور طباعت سے آراستہ ہو جانا چاہئے تھا۔

پیامی عظیم آبادی کے زیر نظر شعری سرمائے کے علاوہ ان کی غزلوں کے دو مجموعے ''گنج گہر'' اور ''برق شرر'' اور نظموں کے دو مجموعے ''فکر و نظر'' اور ''بانگ رحیل'' پہلے ہی منظر عام پر آچکے ہیں جو بعد میں بشکل کلیات ''کان بدخشاں'' کے نام سے شائع ہوئے۔ فنکار کے ذاتی و شخصی پہلو کے اثرات کا اس کے خلق کردہ فن پر مرتب ہونا عین فطری عمل ہے۔ بالفاظ دیگر، تخلیق تخلیق کار کے مزاج کا مظہر ہوتی ہے۔ اس اصول سے شاعر گمنام کے فن پارے بھی مبرا نہیں۔ پیامی عظیم آبادی کی

مجمع الصفات شخصیت کی تشکیل میں تصوف، ادب، صحافت، حکمت اور موسیقی کا نہ صرف خارجی سطح پر عمل دخل رہا بلکہ داخلی سطح پر بھی ان عناصر ترکیبی نے ان کی حساس سرشت کو گہرے طور پر متاثر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں مادی زندگی کے گوناگوں مسائل کے تنوع کے ساتھ ساتھ عارفانہ اور فلسفیانہ رنگ بھی ہویدا ہے۔

نیک و بد کا کوئی اندیشہ نہ اے جان کیا
دل میں جو آیا سمجھ کر ترا فرمان کیا
جب تماشہ گہہ ہستی میں بھی مل سکتے نہ تھے
یاں بلا کر مجھے ناحق ہی پریشان کیا
اک حقیقت کے ہی دو ٹکڑے ہیں عشق اور جمال
بندگی ایک کو دی ، ایک کو سلطان کیا

۱۹۰۹ء میں پیدا اور ۱۹۸۲ء میں خاکدان گیتی کو الوداع کہنے والے پیامی نے ایوان شعر و سخن میں خالص کلاسیکی شعری ماحول میں قدم رنجہ فرمایا۔ تمام تر کلاسیکی اختصاصات سے آراستہ ان کی شاعری میں عرفان کی تیز تر ہوتی وارفتگی اور عشق کے ہر لمحہ فزوں تر ہوتے والہانہ پن کی کرشمہ سازی حسن و عشق کی درمیانی فاصلے کے کرب سے بیقرار قاری کے دل و دماغ کو امید کی کرنوں سے منور کرنے کے علاوہ منزل تک رسائی کا حوصلہ بھی بخشتی ہے۔ ان تمام محاسن کے باوجود اسلوبیاتی سطح پر ان کی متذکرہ کتاب میں ان کا کوئی ذاتی انفراد نظر نہیں آتا۔ لب و لہجے کی سطح پر جستہ جستہ ثقافت سخن کی فنی زمینوں سے بھی انہوں نے استفادے کئے ہیں۔

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
(اقبال)

ہیں نہفتہ ساری حقیقتیں انہیں پردہ ہائے مجاز میں
وہی آئینے میں ہے منعکس جو تھا عکس آئینہ ساز میں
(پیامی)

PDF Compressor Free Version

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
(شاد عظیم آبادی)

پوچھو نہ گداز قلب و جگر کی کیفیتیں اے ہم نفسو
جس کو نہ کسی پہلو ہو سکوں، وہ پگھلے ہوئے سیماب ہیں ہم
(پیامی)

موسم گل ہے تمہارے بام پہ آنے کا نام
(فیض)

لامکاں بے نیازی دل کے ویرانے کا نام
کن فکاں بس شوق وارماں دل میں بس جانے کا نام
(پیامی)

اپنا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے
(جگر)

پہنچے بھی دوست تو بس حسن بیاں تک پہنچے
کوئی اتنا نہیں جو سوز نہاں تک پہنچے
(پیامی)

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
(غالب)

جس طرف نظر ڈالی حشر سا بپا پایا
ایک سی زمیں پائی ، ایک سا سماں پایا
(پیامی)

تاہم پیامی کے ذریعہ برتے گئے اساتذۂ فن کے زمینی تتبع سے ان کی شاعرانہ عظمت مجروح نہیں ہوتی۔ ان سے پہلے بھی کئی اساتذہ نے اپنے متقدمین سے اکتساب فیض کیا ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ جمیل مظہری، عطا کاکوی، شمس منیری اور کلیم عاجز جیسے ان کے معاصرین جہاں عوامی مشاعروں کے اسپاٹ لائٹ کے درمیان اپنی سخنوری کو جلا بخشتے رہے، پیامی محفلوں سے دور گوشہ گمنامی میں عروس غزل کی مانگ افشاں سے، رخسار غازہ سے اور دست حنا سے خاموشی کے ساتھ آراستہ کرتے رہے۔ یوں تو تقریباً ہر صنف سخن مثلاً غزل، نظم، مرثیہ، قصیدہ، قطعہ، رباعی، مثنوی، مسدس، مخمس اور منقبت وغیرہ میں انہوں نے طبع آزمائی کی، لیکن خصوصاً غزل اور نظم کے میدان میں ان کا جوہر فن مکمل آب وتاب کے ساتھ جلوہ نما ہوتا ہے۔ چونکہ ان دونوں اصناف میں ان کے دو دو مجموعے شائع ہوئے ہیں، یہ طے کرنا قدرے مشکل ہے کہ وہ بڑے غزل گو تھے کہ بڑے نظم نگار، لیکن اتنا تو واضح ہے کہ ایک مکمل اور کہنہ مشق شاعر کے طور پر انہیں زمانے سے وہ پذیرائی نہیں ملی جس کے وہ مستحق تھے۔

نام کتاب	:	ذکر کچھ چراغوں کا
مؤلف وناشر	:	فہیم بسمل
اشاعت	:	۲۰۱۵ء
صفحات	:	۳۶۸
قیمت	:	۳۰۰روپے
مبصر	:	ظہیر انور

تحقیق کا کام بڑا صبر آزما ہوتا ہے۔ اس میں خون جگر بھی صرف کرنا پڑتا ہے۔ ایک محقق کو کہاں کہاں کی خاک چھاننی پڑتی ہے، کس کس کے در پر صدا لگانی پڑتی ہے، یہ وہی جانتا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ تحقیق نگاروں کی گراں قدر کاوشوں کی بدولت ہی قدیم فن کاروں کے حالات وکوائف اور ان کے اہم فن پاروں سے ہم روشناس ہو سکے۔ اگر انہوں نے اپنا خون جگر صرف نہ کیا ہوتا تو بہت سارے قابل قدر فن کار گمنام ہی رہ جاتے اور ان کے رشحات قلم سے ہم ہرگز آشنا نہ ہو پاتے۔

زیر تبصرہ کتاب ''ذکر کچھ چراغوں کا'' جواں سال ادیب و ناقد فہیم بسمل کی نئی نیم تحقیقی کتاب ہے جو مرحوم شعرائے شاہجہاں پور کی شعری تخلیقات پر مشتمل ہے۔ میں نے نیم تحقیقی کی اصطلاح اس لئے استعمال کی ہے کہ اس کتاب کی ترتیب وتزئین میں فہیم بسمل کی کچھ تحقیقی کاوشیں بھی شامل ہیں۔ انہوں نے اس کتاب میں شامل کئی مرحوم شعرائے شاہجہاں پور کا کلام ان کے وارثین کے در تک جا کر اور ان سے مکالمہ قائم کر کے حاصل کیا ہے۔ بقول فہیم بسمل اس کتاب میں ان مرحوم شعرائے شاہجہاں پور کا کلام بھی نمونتاً شامل کر لیا گیا ہے جن کا مجموعہ کلام ان کی زندگی میں شائع ہو چکا تھا، مگر اب دستیاب نہیں ہے۔ فہیم بسمل بڑی مثبت سوچ وفکر کے مالک ہیں۔ ان کی مثبت سوچ کا پتہ ان کے اس

PDF Compressor Free Version

جملے سے چلتا ہے کہ ''میرا اپنا ماننا ہے کہ اگر ہم اپنے بزرگوں کا ذکر نہیں کریں گے تو آنے والی نسلیں ہمیں بھی خاطر میں نہیں لائیں گی۔'' شاید اس احساس ہی نے فہیم بسمل کو اس کام کے لئے آمادہ کیا۔ کچھ اہم ترین مرحوم شعرائے شاہجہاں پور کا ذکر انہوں نے بڑے افسوس کے ساتھ کیا ہے جن کے ورثا کے پاس ان کا کلام تو محفوظ ہے، لیکن انہوں نے دینے سے انکار کر دیا۔ ایسے لوگ یقیناً اپنے اجداد کے لئے مخلص نہیں ہو سکتے۔ اس کتاب میں کل سترہ مرحوم شعرائے شاہجہاں پور کا کلام ان کی مختصر سوانح حیات کے ساتھ شامل ہے جو یقیناً قابل مطالعہ ہے۔ چند نمونے دیکھئے ۔

ادا و ناز سے دل لے کے چل دئے گھر کو
ہمارے پاس تم آئے تھے کیا اسی کے لئے

یہ خط سیہ سیکھے بالائے لب سرخ
کہتے تھے دھواں آگ سے پیدا نہیں ہوتا

(احسانؔ شاہجہاں پوری)

وہ رشک نو بہار جو پرتو فگن ہوا
بلبل نے دی صدا کہ چمن اب چمن ہوا

(بے باکؔ شاہجہاں پوری)

وہ شوخ بام پہ جب بے نقاب آئے گا
تو ماہتاب فلک کو حجاب آئے گا

(نواب ناظر علی خاں مجرؔ)

آئینہ رکھ کر وہ مصروف خود آرائی بھی ہے
کیا تماشہ ہے کہ پھر دعوائے یکتائی بھی ہے

(انوری جہاں بیگم حجابؔ شاہجہاں پوری)

فہیم بسمل پہلے بھی شاہجہاں پور کے بقید حیات شعرا کا تذکرہ ترتیب دے چکے ہیں، جس کی خوب پذیرائی ہوئی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب ''ذکر کچھ چراغوں کا'' کی ترتیب و تدوین بڑے سلیقے سے کی گئی ہے۔ کاغذ بہت ہی نفیس استعمال کیا گیا ہے۔ طباعت بھی عمدہ ہے۔ سرورق بھی نہایت دیدہ زیب ہے۔ فہیم بسمل بلاشبہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ البتہ ایک کمی اس کتاب میں محسوس ہوئی کہ شعرا کے کلام پر صاحب کتاب کی اپنی رائے شامل نہیں کی گئی، حالانکہ وہ خود ایک ذی فہم ناقد ہیں اور ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ بھی ''نظریات'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ممکن ہے کتاب کی ضخامت کے بڑھ جانے کے خوف نے انہیں اس کام سے روک لیا ہو کیونکہ ضخامت بڑھتی ہے تو خرچ بھی بڑھ جاتا ہے اور کتاب کی قیمت کا بڑھانا بھی ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اردو والوں کی قوت خرید کو بھی تو مدنظر رکھنا ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ یہ کام مستقبل میں ضرور کریں گے۔ یہ کتاب آنے والی نسل کے لئے تحقیقی کام میں یقیناً مفید ثابت ہوگی اور ادبی حلقوں میں اس کی پذیرائی ہونی ہی چاہئے۔ میں فہیم بسمل کو اتنی خوبصورت اور قابل مطالعہ کتاب کی اشاعت پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

نام کتاب	:	بلند کردار لوگ
مصنف	:	ڈاکٹر کبیر الدین خاں وارثی
ناشر	:	ڈاکٹر مظہر الدین خاں وارثی
اشاعت	:	۲۰۱۴ء
صفحات	:	۱۴۰
قیمت	:	۱۵۰ روپے
مبصر	:	شرف الہدیٰ

ڈاکٹر کبیر الدین خاں وارثی کے مضامین کا مجموعہ ''بلند کردار لوگ'' پیش نظر ہے۔ اس مجموعہ کے مصنف کے تعلق سے پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ نے بتایا ہے کہ:

''ڈاکٹر کبیر الدین خاں وارثی تصوف و عرفان کے اس مشہور و معروف سلسلے کے آدمی ہیں، جو وارث پاک یعنی

PDF Compressor Free Version

حاجی حافظ سید وارث علی شاہ قدس سرہ دیوہ شریف سے منسوب ہے۔ موصوف دوران طالب علمی سے ہی علم و ادب سے ایک فطری ذوق رکھتے تھے ان کا وہبی و موروثی ذوق ادب اس راہ پر انہیں بہت تیز لے چلا۔ اردو فارسی میں نمایاں طور پر ایم۔اے کرنے کے بعد انہوں نے حضرت اوگھٹ شاہ وارثی کی حیات و علمی خدمات پر پی ایچ۔ڈی کا مقالہ لکھ کر ڈگری حاصل کی۔ یہ ان کا اتنا اہم علمی تحقیقی کارنامہ ہے جس کی اشاعت نے ہندو پاک میں انہیں مقبول بنادیا ہے۔''

مصنف نے اپنی زیر نظر تیسری کتاب ''بلند کردار لوگ'' کا انتساب پیرو مرشد حضرت فقیر شاہ وارثی، لاہور (پاکستان) کے نام کیا ہے، جس سے صاحب کتاب کی بزرگان دین واولیائے اللہ سے عقیدت کا پتہ چلتا ہے۔ ان کی شخصیت میں صوفیانہ طرز فکر اور طریق عمل پوشیدہ ہے۔

اکیس عناوین پر مبنی ڈاکٹر کبیر الدین خاں وارثی کی اس کتاب میں کئی اہم شخصیتوں اور بزرگ ہستیوں کی حیات و کارنامے پر مختلف پہلوؤں سے نہایت عمدگی اور خوبصورتی کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان میں شعرائے کرام، سیاسی شخصیات، روحانی پیشوا اور افسانہ نگار شامل ہیں مثلاً ''حاجی وارث علی شاہ اور قومی یکجہتی''، ''حضرت اوگھٹ شاہ وارثی اور قومی ہم آہنگی''، ''اقبال اور قومی یکجہتی''، ''میر کی شاعری کے چند پہلو''، ''اہنسا کے پرستار مہاتما گاندھی''، ''پنڈت نہرو: ایک معتبر انسان''، ''گوتم بدھ: ایک روحانی درویش''، ''گرونانک: ایک برگزیدہ ہستی''، ''گرو گوبند سنگھ کی تعلیمات''، ''ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر'' زیر نظر مجموعہ مضامین ''بلند کردار لوگ'' میں ان کے نقطہ نظر کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہر مکتبہ فکر کی شخصیت پر

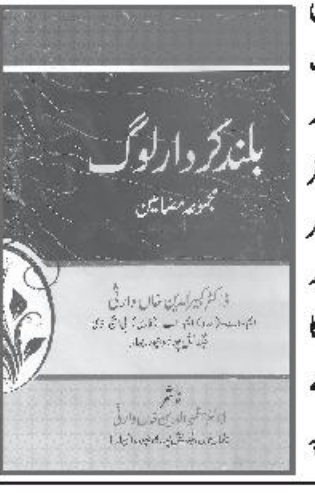

انہوں نے اپنی تحریریں سپرد قلم کی ہیں، ان کی اس کتاب کے مطالعہ سے واقفیت کے کئی Aspects سامنے آسکتے ہیں۔ بلاشبہ اس کتاب کو قومی اتحاد اور فرقہ وارانہ خیر سگالی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور آج کے زمانے کی ضروریات کے پیش نظر اسے ایک اہم کاوش کہا جاسکتا ہے۔

جہاں تک زبان کا تعلق ہے، وہ سادہ اور سلیس ہے اور اس میں ایک حسین اہتمام ملتا ہے۔ البتہ کہیں کہیں کمپوزنگ پر توجہ کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اس مجموعہ مضامین کی یہ خاص بات ہے کہ مصنف نے اپنی تحریروں کو جابجا مناسب اور متعلقہ اشعار سے سجا کر اسے مزید دلچسپ اور مفید بنادیا ہے۔ امید ہے کہ جناب وارثی کی یہ کاوش پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی۔ ❁❁

احمد انکل کے بچوں کا کیا ہوا؟ (ص ۴۷ سے آگے)

میں نے ان سے اس بات کا تذکرہ کیا تو انہوں نے مجھ پر یہ حیرت انگیز انکشاف کیا کہ وہ اور ابو تو ہمیشہ سے ہی احمد انکل کے بچوں کے حالات سے آگاہ تھے۔ وہ اس بات سے بھی واقف تھے کہ وہ سب لوگ عرصہ دراز ہوئے، امریکہ جا بسے تھے، لیکن نہ تو انہیں اور نہ ہی ابا مرحوم کو کبھی یہ اندازہ تک ہوسکا کہ میں یہ سوال اُس وقت سے اپنے ذہن میں لئے پھرتا رہا اور ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ ایک پانچ چھ سالہ بچے سے بھلا کون ایسی سوچ کی امید رکھ سکتا تھا۔ وہ تو ہمیشہ یہی سمجھتے رہے کہ شاید مجھے احمد انکل کے بچے تو کیا خود احمد انکل تک یاد نہ ہوں۔

شاید یہ بھی اللہ کی ہی کوئی مشیت خاص تھی کہ میں ہمیشہ چاہتے ہوئے بھی امی اور ابو دونوں ہی سے یہ سوال کرتے ہوئے کتراتا رہا اور اکثر یہ سوال زبان کی نوک پر آ آ کر واپس پلٹ گیا۔ واقعی اس میں اللہ کی کوئی خاص مشیت تھی، کیونکہ اس سوال کا جواب اگر مجھے امی یا ابو کی زبانی محض لفظوں کی صورت ہی میں مل جاتا تو شاید وہ بات مجھ پر اس قدر اثر انداز نہ ہوتی کہ جتنا اُس جواب کو تیس سال بعد اس طرح سے پاکر ہوئی تھی اور شاید تمام عمر رہے۔ ❁❁

PDF Compressor Free Version

ہماری سرگرمیاں

بتیا میں ''اکادمی آپ تک'' پروگرام کا شاندار انعقاد

پٹنہ: علمی اور ثقافتی ادارے، اپنی اُن سرگرمیوں سے اپنی تازہ پہچان بناتے ہیں جو وقت کے مطالبوں سے خاص طور پر ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ یہ محض ایک خیال نہیں بلکہ ایک عملی صداقت ہے اور اس کا ثبوت بہار اردو اکادمی کے اس پروگرام کی مقبولیت سے ہو رہا ہے جو ''اکادمی: آپ تک'' کے عنوان سے کئی اضلاع میں منعقد ہو چکا ہے۔ گیا اور دربھنگہ کے بعد، بہار اردو اکادمی کا یہ پروگرام ۳؍جنوری کو بتیا میں محترم سید ہاشم رضا کی صدارت میں انعقاد پذیر ہوا۔ گرچہ موسم سرد تھا، لیکن اس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے شائقین اردو نے بڑی تعداد میں اس تقریب کو اپنی شرکت سے نوازا۔

اس موقع پر اکادمی کے سکریٹری مشتاق احمد نوری نے پروگرام کی غرض وغایت پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ اکادمی کا یہ پروگرام اس لئے ہے کہ جو ارباب علم وقلم بہار کے گوشے گوشے میں گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں، ان کی سدھ لی جائے اور انہیں مین اسٹریم میں لے آیا جائے۔ ان کو شایان شان جگہ ملے اور ان کی عزت افزائی کی جاسکے، انہوں نے بتایا کہ اس پروگرام کی مقبولیت ہمارے حوصلے بڑھا رہی ہے اور اس کی ضرورت کا احساس دلا رہی ہے۔ انشاءاللہ پورے بہار کے سبھی اضلاع کے مکمل ہوجانے کے بعد اسے دوبارہ بھی چلایا جائے گا۔

پروگرام کی باضابطہ شروعات تفویض اعزاز کے عمل سے ہوئی۔ سب سے پہلا اعزاز حسرت شادانی کو دیا گیا اور یہ ان کی محبت تھی کہ بہت بیمار ہونے اور کمزور ہونے کے باوجود وہ اسٹیج پر تشریف لاکر شرکائے محفل کو سرشار کر گئے۔ سبھی سامعین نے ان کی اس عمر میں بھی اس ہمت کی داد دی۔

حسرت شادانی کی شاعری اور زندگی کے مختلف کوائف سے متعلق ایک پر از معلومات مقالہ صحافی وشاعر جناب ایس اے خلیل نے پڑھا جسے از حد پسند کیا گیا۔ انہوں نے حسرت شادانی کی شاعری اور زندگی پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ حسرت شادانی کی شاعری میں روایت کی پاسداری ضرور ہے، لیکن انہوں نے ترقی پسند ادب سے بھی رشتہ جوڑا ہے اور ساتھ ہی عصری حیثیت سے دور نہیں رہے ہیں۔ حسرت شادانی کے یہاں جدید اور نئی روشنی کی شاعری بھی قاری کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔

اس محفل میں حسرت شادانی کے بعد افسانہ نگار وشاعر شاکر کریمی کو اعزاز سے نوازا گیا اور ان کی افسانہ نگاری اور شاعری کے مختلف رجحانات کا برملا اظہار ڈاکٹر ظفر امام نے اپنے بھرپور مقالے میں کیا اور کہا کہ ان کے افسانوں کی کئی جہات ہیں اور ان پر مزید تجزیاتی نظر ڈالنے اور ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے اور ان پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

اس موقع پر شاکر کریمی کے افسانوں اور ان کی شاعری پر تقریری گفتگو پٹنہ سے آئے معتبر ناقد صفدر امام قادری نے کی۔ انہوں نے شاکر کریمی کی افسانہ نگاری اور ان کی شاعری کو کئی اعتبار سے قابل اعتنا قرار دیا اور اس تعلق سے کئی اہم باتوں کی طرف اشارہ کیا۔ شاکر کریمی کے ادبی سفر میں آنے والے نشیب وفراز کی بہت خوبصورت انداز میں نشاندہی کرتے ہوئے جناب صفدر امام قادری نے کہا کہ فکشن اور شاعری دونوں ہی میں ان کی خدمات کا بالاستیعاب جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

شاکر کریمی کے بعد عظیم اقبال کو اعزاز دیا گیا۔ اس بہترین افسانہ نگار پر تحریری گفتگو ایم۔ ایم۔ وفا نے کی۔ انہوں نے عظیم اقبال کے فن اور تکنیکی رویے کے حوالے سے بہت کارآمد باتیں کیں۔ عظیم اقبال پر تقریری گفتگو نعیم احمد نعیم نے کی اور کئی اہم نکات سامنے لائے۔ پروگرام کا دوسرا حصہ شعری نشست پر مشتمل تھا۔ اس سے قبل ڈاکٹر ظفر امام، صدر انجمن ترقی اردو نے شال دے کر سکریٹری بہار اردو اکادمی کی عزت افزائی کی۔

PDF Compressor Free Version

اکادمی کے زیر اہتمام بیدی اور عصمت چغتائی پر شاندار قومی سمینار

پٹنہ: اردو ترقی پسند افسانے کی نمایاں شخصیات راجندر سنگھ بیدی اور عصمت چغتائی کی خدمات نہایت وقیع ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریروں سے بعد کی نسلوں کی تربیت کی اور فکشن کی وہ زبان ایجاد کی جس میں تازہ کاری تھی اور نو بہ نو امتیازات موجود تھے۔ ان کی خدمات کے اعتراف کے بغیر اردو کی کوئی بھی ادبی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔

گزشتہ ۹ رجنوری کو بہار اردو اکادمی کی جانب سے منعقدہ شاندار قومی سمینار میں ماہرین نے مذکورہ امور پر اظہار خیال کیا۔ بیدی اور عصمت چغتائی کی صد سالہ تقریبات کے سلسلے سے بہار اردو اکادمی کے زیر اہتمام منعقدہ اس پروگرام میں بہار کے علاوہ بیرون بہار کے نقاد اور ماہرین نے بھی شرکت کی۔

سمینار کے اغراض مقاصد پر بہار اردو اکادمی کے سکریٹری جناب مشتاق احمد نوری نے روشنی ڈالی اور واضح کیا کہ بہار اردو اکادمی نئے ماحول میں متعدد پروگراموں کا خاکہ بنا چکی ہے اور اسی سلسلے کی ایک کڑی کے طور پر راجندر سنگھ بیدی اور عصمت چغتائی کی صد سالہ تقریبات کے تحت اس سمینار کا انعقاد ہو رہا ہے۔ سمینار کے موضوع کا تعارف کراتے ہوئے کالج آف کامرس، پٹنہ کے شعبہ اردو کے استاد جناب صفدر امام قادری نے واضح کیا کہ بیدی اور عصمت کی عہد ساز حیثیت اور ان کے تاریخی کارناموں کا از سر نو محاسبہ ضروری ہے اور اسی لئے اس سمینار کا انعقاد اپنی خصوصی رکھتا ہے۔ جناب قادری نے سمینار کی نظامت کے فرائض بھی انجام دئے۔

اس موقع پر پہلا مقالہ جناب شموئل احمد نے پڑھا۔ انہوں نے بیدی کی کہانیوں پر خود بیدی کے تبصروں کے حوالے سے گفتگو کی اور کہا کہ جنسیات پر اعتراضات کی بیدی نے بہت ہی منطقی انداز سے وضاحت کی ہے۔ جناب شوکت حیات نے ''بیدی: چند یادیں، چند باتیں'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا اور بیدی کی شخصیت کو گویا یادوں کے سہارے لفظوں میں مجسم کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ بیدی بہر حال عورت کی سائیکی کے بہترین ترجمان ہیں۔ اقبال حسن آزاد نے ''ناولٹ کا فن اور ایک چادر میلی سی'' کے عنوان سے اپنے پیش کردہ مقالے میں کہا کہ اس ناولٹ میں بیدی نے بہر حال ایک قبیح رسم کی مخالفت کی ہے۔

دہلی سے تشریف لانے والے مقالہ خواں جناب ابوبکر عباد نے ''بیدی: عورت جنس اور نفسیات'' کے موضوع پر اپنا پر مغز و پر لطف مقالہ پیش کیا اور تقابلی انداز میں پریم چند اور بیدی کے فنی تفاوت اجاگر کرتے ہوئے بتایا کہ بیدی کا تخیل بہر صورت حقائق زندگی کو خوبصورت آرٹ میں ڈھال دیتا ہے۔ بیدی نے بعض تجریدی کہانیاں بھی لکھی ہیں اور یہ کہ ان کی کہانیوں کا مرکزی حوالہ بہر حال انسان کی نفسیات ہے۔

دہلی سے آنے والے دوسرے مقالہ خواں ڈاکٹر واحد نظیر نے ''بیدی کی خاکہ نگاری'' کے خصائص کا جائزہ لیتے ہوئے، اپنے مقالہ میں بیدی کی غیر افسانوی نثر کی اہم خصوصیات کی طرف بھی اشارہ کیا اور بتایا کہ بیدی ''لکھنا ہے'' کے ہمیشہ قائل رہے اور محض ''لکھ دینا ہے'' کے جذبے اور عمل سے انہوں نے کبھی دور کا بھی واسطہ نہیں رکھا۔

پہلے سیشن کی مقالہ خوانی کے بعد سوال و جواب کے وقفہ میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے جناب جمیل اختر نے تقابلی پہلو سے بلونت سنگھ کے بعض فنی امتیازات کی طرف اشارہ کیا اور ارمان نجمی نے کہا کہ بیدی کا ناولٹ دراصل ستی کی رسم کے خلاف ہے۔

وقفہ سوال و جواب کے بعد، سمینار کے دوسرے سیشن کا آغاز ہوا اور عصمت چغتائی پر نہایت عمدہ مقالات پڑھے گئے۔ پروفیسر علیم اللہ حالی اور جناب سلطان اختر کی مشترکہ صدارت سے اس سیشن کو بھی عزت ملی۔ دہلی سے آئے ہوئے مقالہ خواں جناب جمیل اختر نے ''عصمت چغتائی کا تخلیقی سفر:

PDF Compressor Free Version

ایک جائزہ'' کے زیرعنوان اپنی باتیں پیش کی۔ انہوں نے اپنے وقیع تحقیقی مقالے میں بہت ساری نئی معلومات سے سامعین کو نوازا اور عصمت آپا کی افسانوی کائنات کے تعلق سے اعداد وشمار کی روشنی میں بہت ساری باتیں بتائیں۔ انہوں نے کہا کہ اب تک عصمت کی ۱۵۰ کہانیاں تحقیقی اعتبار کے ساتھ دریافت ہوچکی ہیں اور یہ میرے لئے اپنی مسلسل کاوشوں کا خاص حوصلہ افزا صلہ ہے۔

ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے اپنا مقالہ ''عصمت کا فن: اسلوب واظہار کے آئینے میں'' پیش کیا اور حسب موضوع عصمت چغتائی کی زبان و اسلوب کے بعض اہم خصائص کی طرف توجہ دلائی۔ انہوں نے کہا کہ عورتوں کی بات عورتوں کی زبان میں پہلی بار عصمت چغتائی کے یہاں کہی گئی ہے۔ انہوں نے فکشن کی زبان میں گھریلو محاورے سموئے ہیں اور مکالموں میں چپکے سے وار کرنے کا ہنر، ان کے یہاں اپنا خاص انفراد رکھتا ہے۔

نسیم احمد نسیم نے عصمت کے ڈرامہ ''دھانی بانکیں'' کے حوالے سے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے اس ڈرامہ کے فکری وفنی اور مقصدی پہلوؤں کا بھرپور جائزہ لیا اور بتایا کہ مکالموں پر خصوصی توجہ نے اسے اظہار تاثر میں بے حد کامیاب بنادیا ہے۔ اس ڈرامے کا بنیادی پیغام یہی ہے کہ نفرت، نفرت سے نہیں بلکہ محبت ہی سے ختم ہوسکتی ہے۔

دونوں سیشن کی مقالہ خوانی کے بعد، پروفیسر علیم اللہ حالی نے اپنے مختصر خطاب میں کہا کہ فن کاری دراصل تخلیق جدید کا نام ہے، یہاں جو بلند پایہ مقالے پڑھے گئے ہیں ان سے اردو ادب کے طلبا و طالبات کو اسی وقت قرار واقعی فائدہ پہونچ سکتا ہے جب کہ وہ متون کا براہ راست مطالعہ کریں۔ جناب حالی نے پروفیسر شموئل احمد اور جناب جمیل اختر کے مقالات میں پیش کردہ بعض نکات کو بہت ہی اہم بتایا انہوں نے کہا کہ جناب شموئل احمد کا یہ کہنا ایک نئے انداز سے بیدی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے مصداق ہے کہ بیدی کی کہانیاں محض فطری انجام پر نہیں بلکہ سوچے سمجھے نتیجے پر ختم ہوتی ہیں۔ جناب سلطان اختر نے اپنے منظوم صدارتی کلمات کے طور پر دونوں عظیم فنکاروں کی خدمات کا ایک ایک شعر میں یوں اعتراف فرمایا کہ۔

افسانوں سے آگاہ تھیں عصمت آپا ناول کی نئی راہ تھیں عصمت آپا

جب تک رہے فکشن کے طرح دار رہے اس فن کے شہنشاہ تھے بیدی صاحب

اکادمی کی اس سادہ مگر پروقار علمی تقریب کی کامیابی کا کھلے دل سے سامعین نے اعتراف کیا۔ عام ارباب ذوق کے علاوہ نوجوان طلبا و طالبات اور یونیورسٹیوں کے ریسرچ اسکالرز کی کثیر تعداد دونوں سیشن میں موجود رہی۔ تقریب کا اختتام سکریٹری اکادمی کے کلمات تشکر پر ہوا۔

اکادمی میں بیت بازی کا کامیاب پروگرام

پٹنہ: بیت بازی اردو کی تہذیب وثقافت کی آئینہ دار اور طلبا وطالبات کے شعری ذوق کی تربیت کے لیے ایک بہتر ذریعہ ہے۔ بیت بازی پروگرام میں حصہ داری سے نئی نسل کی ادب وشعر سے دلچسپی کا پتا چلتا ہے۔ گزشتہ ۱۶ رجنوری کو بہار اردو اکادمی، پٹنہ کے زیر اہتمام عظیم آباد کے تعلیمی اداروں کے طلبا و طالبات پر مشتمل بیت بازی کے مقابلے سے خطاب کرتے ہوئے اردو زبان وادب کی منتخب شخصیات نے مذکورہ باتیں کہیں۔

اس موقع پر ابتدائی خطاب کرتے ہوئے اکادمی کے سکریٹری جناب مشتاق احمد نوری نے بتایا کہ بیت بازی کی اہمیت کے پیش نظر اکادمی بہار بھر کے تعلیمی اداروں میں ایسے مقابلے کرانے کی کوشش کرے گی۔ اسی کی ابتدا کے طور پر پٹنہ کے کالجوں اور مدارس کے طلبہ وطالبات کے درمیان بیت بازی کا یہ پہلا مقابلہ منعقد کیا جارہا ہے۔ یہ سلسلہ آگے بھی جاری رہے گا اور جو تعلیمی ادارے اکادمی سے رابطہ قائم کریں گے، انہیں اکادمی بیت بازی مقابلہ منعقد کرنے کے لئے معاونت کرے گی۔ انہوں نے توقع ظاہر کی کہ آنے والے وقت میں بیت بازی کے کل بہار مقابلے بھی منعقد کرانے میں ہم کامیاب ہوں گے۔

PDF Compressor Free Version

بیت بازی کے اس پروگرام میں دو ٹیمیں بنائی گئی تھیں۔ پہلی ٹیم میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ اور کالج آف کامرس پٹنہ کے طلبا شامل تھے جب کہ مخالف ٹیم میں شعبہ اردو پٹنہ یونیورسیٹی، مگدھ مہیلا کالج، پٹنہ کالج اور نظامیہ پبلک اسکول کے طلبا کی شمولیت رہی۔ بیت بازی کے اصول وضوابط کے مطابق مشاہدین اور معزز ججوں کی نگرانی میں یہ پروگرام مکمل ہوا۔ اس پروگرام میں پروفیسر علیم اللہ حالی، جناب خورشید اکبر اور ڈاکٹر واحد نظیر (جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی) بہ طور جج موجود تھے۔ انہوں نے فیصلہ سناتے ہوئے بتایا کہ دونوں ٹیموں نے بہترین ادبی وشعری صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا جس کے سبب تین گھنٹے تک مقابلہ آرائی کے باوجود دونوں ٹیموں میں سے کسی کو شکست نہیں حاصل ہوئی، دونوں ہی فاتح رہیں۔

جج ٹیم کی طرف سے جناب خورشید اکبر نے بیت بازی کے نتائج کا اعلان کیا۔ انہوں نے بتایا کہ مختلف طرح کی غلطیوں کے سبب مخالف ٹیموں کو جو بونس پوائنٹ ملے، ان کی رو سے بھی دونوں ٹیموں نے 14-14 پوائنٹس حاصل کیے اور مقابلہ برابری پر مکمل ہوا۔ انہوں نے دونوں ٹیموں سے 3-3 ایسے منتخب طلبا کو خصوصی انعامات دیے جانے کی سفارش کی جنہوں نے زیادہ بہتر انداز میں اشعار سنائے یا شعر کا انتخاب کرتے ہوئے ادبی معیار کا لحاظ رکھا۔ ان طلبا وطالبات میں افشاں بانو، عارف حسین، فیض النساء، عبدالقادر، طارق انور اور عبدالقہار نمایاں تھے۔ انہیں بہار اردو اکادمی کی مطبوعات کا خوبصورت سیٹ بطور انعام دیا گیا۔

واضح رہے کہ بیت بازی کے اس پروگرام میں مدرسہ شمس الہدیٰ سے محمد نسیم الحق، محمد انجم، محمد معراج اور منور حسین، کالج آف کامرس سے ڈاکٹر الفیہ نوری، شبنم، محمد عابد کریم، نازیہ امام، شگفتہ ناز، واجدہ تبسم اور جوہر امام، شعبہ اردو پٹنہ یونیورسیٹی سے محمد ضیاء العظیم، شاہد وصی، گلاب الدین، روحی پروین، جسمین خاتون، کامران غنی صبا، مگدھ مہیلا کالج پٹنہ سے غزالہ یاسمین، وفا ہاشم، ترنم آس، کہکشاں پروین، پٹنہ کالج سے سمیہ رضوانہ، نظامیہ پبلک اسکول سے منورہ فاطمہ اور سپول سے اشفاق احمد ساقی اور محمد جمشید شامل تھے۔

مظہر الحق عربی فارسی یونیورسیٹی کے وائس چانسلر پروفیسر اعجاز علی ارشد، پروفیسر علیم اللہ حالی، جناب خورشید اکبر اور جناب واحد نظیر نے طلبا و طالبات کے درمیان کتابوں پر مشتمل انعامات تقسیم کیے۔ تمام مہمانوں نے بیت بازی میں حصہ لینے والے طلبا وطالبات کی حوصلہ افزائی کے ساتھ انہیں اس نوعیت کے مقابلوں کی اہمیت وافادیت پر توجہ دلائی اور بیت بازی کے تعلق سے آموزش آداب کے انداز میں بتایا کہ آنے والے وقت میں انہیں کس طور پر ادب وتہذیب کی حفاظت کرنی ہے اور شعر خوانی کے طریقوں پر مختلف جہت سے مضبوط گرفت بنانی ہے۔

بہار اردو اکادمی میں رسم پرچم کشائی

پٹنہ: بہار اردو اکادمی میں حسب روایت، یوم جمہوریہ کے موقع پر، سکریٹری اکادمی مشتاق احمد نوری کے دست مبارک سے پرچم کشائی کی رسم عمل میں آئی۔ اس تقریب میں سکریٹری موصوف اور جناب سلطان اختر نائب صدر اکادمی کے علاوہ متعدد معزز عمائدین شہر اور طلبا وطالبات نے شرکت کی اس موقع پر جناب نوری نے بات چیت کے دوران اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ بیشک، آزادی وطن کے ساتھ جمہوری نظام ہمارے لئے ایک بڑی نعمت ہے۔ ہندوستان مختلف مذاہب اور زبانوں کا گلدستہ ہے اور جمہوری آئینی نظام اس گلدستے کے ہر پھول کو اپنی بہاریں دکھانے کا موقع دیتا ہے۔ اس نظام کا تحفظ، اس کی قدر اور اس کی برکتوں کا مسلسل احساس رکھنا ہم سبھوں کی ذمہ داری ہے۔

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

سلام و پیام

☆ ''زبان وادب'' جنوری ۲۰۱۶ء کا شمارہ حسب معمول خوبصورت سرورق اور اعلیٰ مضامین کے ساتھ منظر عام پر ظہور پذیر ہوا ہے۔ پروفیسر رضیہ تبسم نے حسین ظفر کی شخصیت پر مبنی اعلیٰ مقالہ پیش کیا ہے۔ اس میں بسملؔ عظیم آبادی کے نام کا حوالہ صفحہ ۱۴ پر دیا گیا ہے۔ نئی تحقیق کے بموجب انہوں نے ہی ''سرفروشی کی تمنا، اب ہمارے دل میں ہے'' مطلع والی مشہور نظم کہی تھی، نہ کہ شری رام پرساد بسملؔ نے جو کہ کم تعلیم یافتہ تھے اور شاعری بھی نہیں کرتے تھے۔ رام پرشاد بسملؔ تحریک آزادی کے سربراہ مجاہدوں میں سے ایک ضرور تھے لیکن تخلص بسملؔ کی مشابہت کے باعث ہی ان کے نام کے ساتھ نظم کو منسوب کر دینے کی غلطی سرزد کی جاتی رہی تھی۔ بسملؔ عظیم آبادی شہرۂ آفاق استاد شاعر شادؔ عظیم آبادی کے شاگرد تھے۔ عبد الصمد کے ایک ناولٹ کے ہی مساوی طویل افسانے زیر عنوان ''آپ ہرن'' کا تجزیہ قابل دید اور لائق ستائش ہے۔ فقط اس کے عنوان سے اس خاکسار کو اختلاف ہے، کیونکہ مصطفیٰ خاں مداحؔ کے موقر ''اردو ہندی شبد کوش'' ص ۷۷ کے مطابق لفظ ''استحصال'' کے یہ معنی درج کیے گئے ہیں: ''پراپت کرنا، لینا، حاصل کرنا'' دیگر لغات میں بھی اس لفظ کے معنی ''آپ ہرن'' ہی دیے گئے ہیں، لہٰذا ''آپ ہرن'' کی بجائے عنوان ''استحصال'' ہی قدرے مناسب ہوتا۔ اس افسانے میں شہرۂ آفاق ہندی اور اردو کے ادیب منشی پریم چند کے ہی مواد و اسلوب میں معاشرے میں بلند پایہ درجے کے افراد کے نچلے طبقوں کے تئیں حد درجہ کی بے اعتنائی درخورِ نفرت ہی منعکس کی گئی ہے۔ اس شمارے کے تحت اصغری بیگم صاحبہ نے اپنے مختصر سے مضمون میں ''بے نظیر شاعر نظیر اکبر آبادی'' کی شاعری کا شاندار تجزیہ پیش کیا ہے۔ اول صفحے پر ''جب لاد چلے'' الفاظ کے بعد لفظ ''گا'' چھپنے سے محروم ہو گیا ہے۔ اسی طرح ''کے علاوہ میں'' الفاظ کے تحت ''میں'' لفظ اضافی یا زائد ہے اور اگلے صفحے پر بھی ''شاعری کا اعتراف کی منتظر رہی'' میں ''کا'' لفظ اضافی ہے۔ نظیر اکبر آبادی کا کم تعلیم یافتہ ہونا تو ان کی شخصیت میں ایک اور کلفی کا منسلک ہونا بھی مانا جا سکتا ہے۔ ان کی بلند پایہ و اعلیٰ شاعری کے تئیں بے رخی کے تناظر میں یہ راقم ممتاز راشدؔ کا یہ جاندار شعر رقم کر رہا ہے۔

کتنی تحریریں سجی ہیں وقت کی دیوار پر
کون کہہ سکتا ہے کہ کیا مٹ جائے کیا باقی رہے

اسی شعر کے مفہوم سے موازنہ کرنے کے لیے دوئم شعر حسن کمال کا یہ ہے۔

وقت ہی ناقد ہے ایسا، جس کو سب معلوم ہے
حرف کے پردے میں کس نے کیا کہا، کیسا کہا

اسی شمارے میں آخری شائع خط میں بیگو سرائے کے باشندے جناب جمیل اختر نے جن اغلاط کی بالخصوص نشان دہی کی ہے، وہ بھی قابل ستائش کہی جائے گی۔

کرشن بھاوک، پٹیالہ، پنجاب

☆ ''زبان وادب'' ملا۔ سال رواں کا یہ پہلا شمارہ اضافی ضخامت کے ساتھ دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ ابھی ذکیہ مشہدی صاحبہ کے ناولٹ ''پارسا بی بی کا بگھار'' اور پروفیسر اعجاز علی ارشد کے سفرنامہ ''موریشس میں سات دن'' کو بالاستیعاب پڑھنے کا اگرچہ موقع نہیں مل سکا ہے، لیکن ان تخلیقات کی ابتدائی سطریں ہی بتا رہی ہیں کہ یہ قاری کے لئے افادیت سے خالی نہیں ہوں گی۔ آپ نے یہ شمارہ خواتین قلم کاروں کے لئے خاص کر دیا ہے اور جیسا کہ اداریے میں لکھا ہے، یہ گویا بقعتاً ایک خیال کو عملی جامہ پہنانے کی صورت ہے اور مجھے لکھنے دیجئے کہ یہ صورت بہت کامیاب رہی ہے۔ یہ ایک طرف تو آپ کی صحافتی کامیابی اور بالغ نظری کی آئینہ دار ہے اور دوسری طرف اس سے اردو ادب اور شاعری میں خواتین کے حصہ کی قوت اور وسعت و معنویت کا بھی اندازہ ہوتا

PDF Compressor Free Version

ہے۔آپ نے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ وہ زمانہ جا چکا جب اردو کی پہلی خاتون ناول نگار کو اپنے نام کی جگہ ''والدہ بیرسٹر محمد سلیمان'' لکھنا پڑا تھا، اب تو صورت حال بہت خوش آئند ہوتی جارہی ہے اور مجھے لکھنے دیں کہ اس کا ایک تازہ ثبوت ''زبان وادب'' کا یہ شمارہ بھی ہے۔ ''مقالات'' کا حصہ بھی مفید معلومات ہے اور ''منظومات'' کا حصہ بھی بہت سجا سجایا ہے الماس شبی کا شعر ۔

ہاتھ تھاما نہ حال ہی پوچھا
یوں بھی کوئی سلام کرتا ہے

دل کو چھو گیا اور سلمیٰ حجاب کی غزل میں ''دھوپ'' کے رنگ بھی بہت پیارے ہیں۔ ''میر کلو کی گواہی'' پر ڈاکٹر شائستہ انجم نوری کا تبصرہ بہت ہی جامع ہے اور ''کلیاں کھلنے دو'' پر محترمہ زیبا پروین نے بھی بہت ہی سنجیدہ تبصرہ لکھا ہے، بیشک ان تبصروں کی شکل مضمون جیسی ہوگئی ہے جو انفرادیت اور افادیت سے بھرپور ہے۔

گل آفریں، مظفر پور

☆ ''زبان وادب'' کا تازہ شمارہ ملا۔ نئے سال کی یہ انمول سوغات پاکر بے انتہا مسرت محسوس ہو رہی ہے، جسے اگرچہ الفاظ دینا مشکل ہے پھر بھی ایک منظوم کوشش حاضر خدمت کر رہی ہوں۔

رسالہ بھی کیا پیارا پیارا لگے
سرورق اس کا نرالا لگے
مزین ہے عمدہ مضامین سے
ہے آراستہ حسن تزئین سے
خواتین کا بول بالا ہوا
ہے کردار ان کا ہی چھایا ہوا
ہے کیسی حسیں اس کی شادابیاں
زبان و ادب کی وہ گل کاریاں
نئے سال کا ہے یہ تحفہ نیا
لگا مجھ کو پھر سے مجلہ نیا
کریں اس کی جتنی بھی تعریف کم
ہوئے جاتے ہیں میرے الفاظ کم
جناب احمد نے کافی ارمان سے
نکالا رسالہ نئی شان سے
دعا ہے فلک کی بلندی ملے
رسالے کو کافی ترقی ملے
درخشاں رہے ، جگمگاتا رہے
جہانِ ادب پہ یہ چھاتا رہے

شبانہ عشرت، پٹنہ

☆ ''زبان وادب'' ماہ دسمبر ۲۰۱۵ء ملا۔ ''شہادت کی انگلی اور ٹریگر'' اختر آزاد، ''پھول کھلنے دو'' اقبال حسن آزاد، ''سپنوں کے قاتل'' مہر افروز، ''ساتھ کا احساس'' غزالہ پرویز اور ''آخری کہانی'' نورالعین ساحرہ، تازہ شمارے کے یہ افسانے اچھے لگے، لکھنے والوں نے اپنی فنی مہارت کا اظہار بڑے خوبصورت انداز اور خوبصورت پیرائے میں کیا ہے۔ واقعات کی ترتیب، مکالموں کی چستی، کردار نگاری، منظر نگاری اور آغاز وانجام میں قابل تحسین ربط نے ان افسانوں کو زندگی سے مربوط اور مقصدی بنا دیا ہے۔ آپ کی آمد اور ادارت نے ''زبان وادب'' کے تخلیقی معیار و وقار کو بہت بلند کر دیا ہے، یہ تازگی، تنوع اور انفرادیت، مشمولات کے مطالعے سے ملتی ہے، شعریات کا حصہ بھی رسیلا اور لذیذ ہے، بعض اشعار تو ذہن میں جگہ بنانے کے لئے اکساتے ہیں۔ ''صدف'' میں آپ کا افسانہ ''جادوگر'' مطالعہ سے گزرا، افسانہ ملک کے حالات اور تیزی سے تبدیل ہونے والے سیاسی مناظر پر ایک طنز ہے۔ افسانے کی خوبی میں بے پناہ منظر کشی بھی شامل ہے جو اس افسانے کی صفت ہے، ناظرین کے جذبات شوق اور احساس بیتابی کو بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے، واقعہ نگاری، کردار نگاری، انسانی جبلت وفطرت کی چلتی پھرتی تصویر نگاہوں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔ زبان و بیان، سادہ الفاظ مناسب اور موزوں، یہ افسانہ زبردست قوتِ متخیلہ کا اظہار ہے۔ اللہ آپ کو صحت کے ساتھ عمر طویل دے۔ آمین

نذیر احمد یوسفی، آسنسول

PDF Compressor Free Version

☆ ''زبان و ادب'' کا رواں سال کا آخری شمارہ نظر نواز ہوا۔ سرورق پر مسجد کی تصویر نے اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگا دیا ہے۔ مسجد پاکیزگی کی علامت ہے اور اس طرح یہ سرورق گویا آپ کے پاکیزہ جذبات وخیالات، افکار اور ارادوں کی ترجمانی کر رہا ہے۔ آپ کی موجودگی نے بہار اردو اکادمی کو نئی بلندی عطا کی ہے۔ نئے نئے پروگراموں کا اعلان اور اس کی تکمیل کی طرف ثبت قدم یقیناً آپ کی نیک نیتی کا بین ثبوت ہے۔ اس بار کا اداریہ بھی بڑا ہی پرعزم اور حوصلہ مند ہے جو مستقبل کی بہتری کا پتہ دے رہا ہے۔ اس شمارے میں مہر افروز صاحبہ نے ''سپنوں کے قاتل'' کے ذریعہ جس ہندوستانی پس منظر کو پیش کیا ہے، اسے پڑھ کر واقعی کلیجہ منہ کو آ گیا۔ پروفیسر طارق جمیلی صاحب کا مضمون اچھا تو ہے، مگر تشنگی کا احساس دے گیا۔ راشد انور راشد نے قاضی عبدالستار صاحب کی زندگی پر کئی نئے اور ان کہے پہلوؤں سے روشنی ڈالی ہے جو یقیناً اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قاضی صاحب سے موصوف کے گہرے روابط ہیں۔ ظفر کمالی صاحب کی نظم ''پانی'' بہت عمدہ ہے جو بچوں کے ساتھ ساتھ بڑوں کو بھی متاثر کرتی ہے۔ کتابوں پر عمدگی سے کیا گیا تبصرہ بھی پسند آیا۔

ارشد قمر، پلاموں

☆ سرورق پر دیدہ زیب عمارت کی تصویر لئے، ماہ دسمبر ۲۰۱۵ء کا ''زبان وادب'' پیش نگاہ ہے۔ آپ کا اداریہ انتہائی حوصلہ افزا ہے جسے پڑھ کر جی خوش ہو گیا۔ بڑوں کا حصہ ہو یا بچوں کا حصہ، رسالے میں سبھی کچھ قابل تعریف ہے اور بیشک اس کا سہرا آپ کے سر بندھتا ہے۔ رسالے میں متواتر نئی تخلیق نئے نام اور نئے چہرے دیکھ کر بے حد خوشی ہو رہی ہے۔

شکیل سہسرامی، پٹنہ

☆ ''زبان وادب'' دسمبر ۲۰۱۵ء تاخیر سے موصول ہوا۔ زیر نظر شمارہ میں حسب معمول مقالے اور افسانے سب عمدہ اور معیاری ہیں۔ نظم کا حصہ بھی خاصا اچھا ہے۔ ''بچوں کا زبان وادب'' بھی بلندی کی طرف جا رہا ہے۔ یہ سب آپ کی محنت اور لگن کا نتیجہ ہے، نئے سال کی مبارک باد قبول فرمائیں۔

اسلام احمد شاہی، بھاگلپور

☆ ''زبان وادب'' دسمبر ۲۰۱۵ء باصرہ نواز ہوا۔ میں بڑے شوق سے آپ کا اداریہ پڑھتی ہوں۔ عہدہ سنبھالتے ہی آپ نے جو کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں وہ ملک کی دیگر اکادمیوں کے لئے مشعل راہ ہے۔ آئندہ پروگرام بھی غماز ہیں کہ آپ فروغ اردو کے لئے نمایاں کام انجام دیں گے۔ ''زبان وادب'' کے معیار میں بھی نمایاں تبدیلی ہوئی ہے۔ اب اس کا شمار بین الاقوامی رسالہ میں ہوگا۔ زیر نظر شمارہ میں تمام مشمولات خصوصاً نثری حصہ میں نئے اور مستند قلم کاروں کی مشمولیت قابل افتخار ہے۔ شعری حصہ میں سوائے طرزی صاحب کی نظم کے باقی چیزیں اپیل نہیں کرتی۔ پہلی غزل قوس صدیقی کی ہے سب سے زیادہ اسی نے مایوس کیا۔ اگر قوس صدیقی کی غزل کے ساتھ اس کی وضاحت بھی شائع کر دیتے تو مجھ جیسی کم مائع قاری کو ان کی شاعری سمجھنے میں آسانی ہوتی۔ ''بچوں کا زبان وادب'' بھی ذائقہ دار ہو گیا ہے۔

گل فشاں حیدر، پٹنہ

خریداروں کے لئے ضروری اطلاع

☆ محکمہ ڈاک نے انڈر پوسٹنگ سرٹیفکیٹ سسٹم ختم کر دیا ہے، لہٰذا خریدار حضرات کو اب سادہ ڈاک سے رسالہ بھیجا جاتا ہے۔ رسالہ کی گمشدگی کے لئے ادارہ پر کسی طرح کی کوئی ذمہ داری اور باز پرس نہیں ہوگی۔ اگر رجسٹرڈ پوسٹ سے رسالہ منگانا چاہتے ہوں تو اس کے لئے زر سالانہ ۳۵۰ روپے ہوگا۔

☆ اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے۔ اگر اگلے سال کا زر سالانہ آپ سے موصول نہیں ہوا تو یہ سمجھا جائے گا کہ آپ آگے خریدار بنے رہنا نہیں چاہتے۔ (سرکولیشن انچارج)

PDF Compressor Free Version

بچوں کا زبان وادب

☆	حضرت عائشہؓ	فاطمہ جبیں	۷۴
☆	اب پھر نہیں	نذیر احمد یوسفی	۷۵
☆	سمجھ: کمال بھی وبال بھی	عائشہ رفعت	۷۶
☆	اعتراف	جمیل اختر شفیق	۷۷
☆	باپ، بیٹا اور گدھا	شاذیہ حسن	۷۹
☆	مشورہ	کرشن پرویز	۸۰
☆	جانوروں کی فریاد	ڈاکٹر محمد زاہد	۸۰

PDF Compressor Free Version

فاطمہ جبیں
C/o S.M. Sajjad, Kaghzi Mohalla, Bihar Sharif 803101 (Nalanda)

حضرت عائشہؓ

مری بچیو! گرچہ انساں ہے فانی
نہیں مٹتی حسن عمل کی کہانی

جو تاریخ کھولوگی ، معلوم ہوگا
بڑا معتبر نام ہے عائشہؓ کا

تہہ دل سے شوہر پہ قربان تھیں یہ
محمدؐ کی بن کر دل و جان تھیں یہ

پدر سے ملی تھی انہیں جاں نثاری
صداقت کا جذبہ اطاعت گزاری

نچھاور تھے اوصاف یوں ان کے اوپر
دلہن جیسے پہنے ہو انمول زیور

خطاب یوں تو صدیقہ تھا عائشہ کا
محبت سے کہتے تھے آقا حمیرا

بڑی خوبصورت ، بڑی نیک سیرت
مروت کا پیکر سراپا اطاعت

نہایت مناسب لقب طاہرہ ہے
یہ تاج فضیلت خدا سے ملا ہے

یہ عظمت تو دیکھے کوئی عائشہؓ کی
کہ عصمت کی قرآں نے دی ہے گواہی

حقیقت کا درپن ، صداقت کی پتلی
نہ کیوں ہوں کہ صدیق کی تھیں جو بیٹی

سلیقے تھے خود ان کے اوپر نچھاور
جڑے جائیں جیسے انگوٹھی میں گوہر

بڑی دور بیں ، صاف دل ، پاک فطرت
تھی اسلام سے والہانہ محبت

جو علمی جواہر سے آراستہ تھیں
یہ دینی مسائل سے بھی آشنا تھیں

حدیث ان سے اصحاب سنتے تھے آ کر
سناتے تھے پھر اہل ملت کو جاکر

شکایت نہ تھی ذرہ بھر بھی نبی سے
گزر کر رہی تھیں بڑی سادگی سے

مکاں ان کا اک مدرسہ تھا ادب کا
سنورتا تھا اس گھر میں اخلاق سب کا

دلِ پاک میں ان کے خوفِ خدا تھا
نہایت عبادت میں آتا مزہ تھا

کوئی دیکھے اس نیک عورت کی قسمت
نبی کا تھا سر گود میں وقت رحلت

جہاں ہیں حضور آج آرام فرما
تھا حجرہ کبھی حضرتِ عائشہؓ کا

کرو قدر تم بچیو! جتنی کم ہے
کہا ان کو قرآن نے محترم ہے

PDF Compressor Free Version

نذیر احمد یوسفی

"Urdu Darbar" Rahmania School Street
P.o.Asansol Dist Burdwan 713302 (W.B)

اب پھر نہیں

ذیشان کی والدہ انوری بیگم، ذیشان کو اسکول خود اپنی اسکوٹی کے ذریعہ پہنچاتی تھیں، اسکول زیادہ دور نہیں تھا۔ اس لئے انہوں نے بس کی جھنجھٹ سے خود کو بچایا تھا۔

ذیشان آج تین دنوں بعد اسکول جارہا تھا، پچھلے دنوں اسکول میں اس کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔

ذیشان آسنسول جیک اینڈ جل اسکول کے دوسرے درجے میں پڑھتا تھا، پڑھنے میں اچھا اور محنتی تھا، بس ایک برائی تھی کہ وہ اسکول میں موقع ملتے ہی الم غلم چیزیں خرید کر کھانے کا عادی تھا.....اس خراب عادت کی وجہ کر کئی بار بیمار بھی ہوا تھا اور امی کی ڈانٹ بھی کھائی تھی، مگر وہ ذیشان ہی کیا جو چٹ پٹی چاٹ، گول گپے اور بھیل پوری کے مزیدار کھانے سے توبہ کرلے۔

انوری بیگم نے ذیشان کو اسکول کے گیٹ کے اندر لاکر چھوڑا اور خود پرنسپل صاحب کے کمرے میں اجازت لے کر داخل ہوئیں اور تین دنوں کے ناغے کی میڈیکل رپورٹ جمع کی۔ انوری بیگم کو پرنسپل صاحب پہچانتے تھے، مسکرا کر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خیریت پوچھی؟

انوری بیگم نے ذیشان کی شکایت شروع کی تو وہ ایک بار پھر مسکرائے اور کہا:

''میڈم! بچپن میں ہر کوئی اس قسم کی چٹ پٹی چیزیں کھا کر جوان ہوتا ہے، آپ نے بھی اسکول میں کھایا ہوگا میں نے بھی کھایا ہے، آپ اتنا ٹینشن مت لیجئے۔ آہستہ آہستہ وہ خود ہی راہ پر آجائے گا اور اپنی ان گندی عادتوں کو چھوڑ دے گا.....''

۲۱ نومبر کی صبح دس بجے بس کے ذریعہ دوسرے درجے کے تمام بچے مائی تھام ڈیم گھومنے، کھانے پینے، کھیلنے کودنے اور پکنک کے مزے لینے کے لئے تیار ہوکر آگئے تھے۔

انوری بیگم نے ذیشان کو تیار کر کے خود اسکول پہنچایا تھا اور خاص تاکید یہ کی تھی کہ باہر کی کوئی چیز خرید کر نہ کھائے، کھانے پینے کی اچھی اچھی مزیدار چیزیں اسکول کی طرف سے ڈیم پر تمام بچوں کے ساتھ تمہیں بھی ملیں گی، اس لئے فالتو میں روپے خرچ کر کے پیٹ خراب نہ کرنا، ابھی ہفتہ دنوں پہلے ہی تم بیماری سے اٹھے ہو۔

ذیشان نے بڑے خلوص سے سر ہلا کر ایسا ہی کرنے کا اقرار کیا تھا: ''امی! وعدہ کرتا ہوں کچھ نہیں کھاؤں گا.....''

لگژری بس کے کھلنے میں دیری تھی، کھانے پینے کھیلنے اور بچھانے کے تمام سامان بس کی چھت پر رکھ کر رسیوں سے باندھے جارہے تھے سارے بچے اسکول کیمپس میں اچھل کود مچائے ہوئے تھے، بس ذیشان تھا جو گیٹ سے باہر نکل کر آلو دم کی پلیٹ ختم کر کے اب گول گپے منہ میں ٹھونسے جلدی جلدی پیٹ میں اتارنے کی کوشش میں مشغول تھا۔ نہ جانے کب پکنک میں کھانے کو ملے، اس لئے امی نے پہلے ہی ایک پراٹھا زیادہ کھلا دیا تھا، اب جو ایک کے بعد ایک کھٹی میٹھی اور تیل و مرچ والی بازاری چیزیں پیٹ میں گئیں تو ابکائی آگئی اور پیٹ کا سارا مال باہر آگیا، سر بھی چکرانے لگا۔

ذیشان ڈر گیا۔ یا اللہ! یہ میں نے کیا کیا، امی نے کتنا سمجھایا تھا، مگر میری تو مت ماری گئی تھی کہ میں نے امی کی ساری باتیں بھلا دیں اور اپنی من مانی کر گیا۔ اللہ معاف کردے، اللہ بچادے، اب آئندہ نہیں کروں گا.....مگر اللہ تو اچھے اور نیک لوگوں کی فریادیں سنتا ہے۔ ذیشان جیسے ضدی اور ماں باپ کی باتیں نہ سننے والے کی تھوڑی ہی، لہٰذا وہی ہوا،

(بقیہ ص ۷۸ پر)

PDF Compressor Free Version

عائشہ رفعت

Alamganj, Patna 800007

سمجھ: کمال بھی وبال بھی

پیارے بچو! اللہ نے انسان کو عقل سمجھ دی ہے اور یقینی طور پر یہ اس کی ایک بڑی نعمت ہے۔ سمجھ صرف باتوں ہی میں نہیں بلکہ ہر قسم کے کاموں میں بھی ہمارے لئے رہنما کا درجہ رکھتی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ سمجھ ہی کی وجہ سے دوسری تمام صفتوں کی قدر ہوتی ہے قدر ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے اپنے موقع پر کام میں لائی جاتی ہیں اور جو شخص ان سے فائدہ اٹھاتا ہے یا دوسروں کو فائدے پہنچاتا ہے اس کا بڑا نام ہوتا ہے۔

علم ہو یا عقل، سمجھ کے بغیر یہ دونوں ہی ناچیز اور بے فائدہ ہیں، سمجھ نہ ہو تو بھلائی برائی دکھائی دیتی ہے اور آدمی وقت پر غلطیاں کرتا ہے اور طرح طرح کے نقصانات اٹھاتا ہے۔ اس کے برعکس آدمی کے پاس اگر سمجھ ہو تو اس میں پہلے سے موجود خوبیاں نکھرتی بھی ہیں اور دوسری نئی نئی خوبیاں ابھرتی بھی چلی جاتی ہیں۔

سمجھدار آدمی جب کسی سے باتیں کرتا ہے تو اس کی لیاقت جانچ لیتا ہے اور اس کی عقل وفہم کے موافق ہی مناسب لفظوں میں اور مناسب لہجے میں اس سے باتیں کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی بات اثر ڈالتی ہے اور فائدے سے خالی نہیں رہتی۔

سرسید احمد خاں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ جس آدمی میں اعلیٰ درجے کی لیاقت ہو، لیکن سمجھ نہ ہو وہ ایک نہایت قوی اور زبردست اندھے کی مانند ہے جو اپنے اندھے پن کے سبب اپنے زور اور اپنی قوت سے کچھ کام نہیں لے سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ کسی آدمی میں چاہے ہزاروں لاکھوں خوبیاں ہوں، مگر اس کے اندر سمجھ نہیں ہو تو وہ دنیا میں کسی کام کا نہیں۔ برخلاف اس کے، اگر آدمی کے پاس سمجھ پوری ہو اور باقی خوبیاں ذرا کم بھی ہوں تو وہ اپنی زندگی میں بہت کچھ کر سکتا ہے۔

سمجھ انسان کے لئے جس طرح بڑا کمال ہے اسی طرح بہت بڑا وبال بھی۔ وہ اس طرح کہ یہی سمجھ جب مکاری میں بدل جاتی ہے تو ہزار آفتوں کی ایک آفت بن جاتی ہے۔ مکاری اصل میں اس سمجھ کو کہتے ہیں جس میں صرف خودغرضی ہوتی ہے۔ سمجھ ایک روشن آنکھ کی مانند ہے تو مکاری ایسی کوتاہ نظر آنکھ کی مانند جو صرف پاس پاس کی ناچیز چیزوں کو دیکھتی ہے۔ سمجھداری میں بلندی ہوتی ہے اور مکاری میں پستی، سمجھ جس قدر ظاہر ہوتی ہے، اسی قدر آدمی کا وقار و اعتبار بڑھتا ہے، لیکن مکاری کا معاملہ یہ ہے کہ وہ ایک مرتبہ ظاہر ہو گئی تو آدمی ہمیشہ کے لئے اپنی قوت اور عزت کھو دیتا ہے اور کسی کام کا نہیں رہتا۔ ہر شخص اس کی ذات اور اس کی بات سے پناہ مانگنے لگتا ہے اور سماج میں وہ ہمیشہ گری ہوئی اور شک بھری نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے بڑے ہوں یا بچے، ایسے لوگ گھر سے باہر تک اپنا بھروسہ کھو دیتے ہیں۔

سمجھ عقل کے لئے کمال ہے اور مکاری عقل کے لئے زوال، اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ مکاری، سمجھداری جیسی دلکش چیز کی بگاڑی ہوئی نقل کا نام ہے۔ سمجھ کو بسا اوقات ''عقل'' اور ''تمیز'' بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اسی کی بدولت آدمی عقل کا استعمال کر پاتا ہے اور اسی سے بھلائی اور برائی میں تمیز کی جاتی ہے اور ہم سب جانتے ہیں کہ عقلمند اور تمیزدار آدمی کی دنیا میں ہر جگہ قدر ہوتی ہے۔ سمجھ کا خیال رکھنا ہی اس میں کمال پیدا کرنا ہے۔ سمجھ جب اپنا قدرداں پا لیتی ہے تو کبھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی اور اسے دھوکا نہیں دیتی ہے۔ ہم سب نے ایسی بہت ساری کہانیاں سن رکھی اور پڑھ رکھی ہیں جو سمجھداری کا فائدہ ظاہر کرتی ہیں۔ یہ عام زندگی کے تجربے میں آنے والی بات بھی ہے اس لئے ہمیں ہمیشہ سمجھداری میں کمال پیدا کرنا اور اس کے وبال سے بچنا چاہئے۔

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

جمیل اختر شفیق

سنڈوارہ، مدھوراپور، باجپٹی، سیتامڑھی، بہار 843314

اعتراف

ٹھنڈی کے موسم میں معمول کے مطابق صابر صبح کے وقت اپنے ابو کے ساتھ چہل قدمی کر رہا تھا، چلتے چلتے اس کے پیر تھک گئے تو وہ ایک پارک کے کنارے بیٹھ کر آرام کرنے لگا، اس بیچ اس کے ابو اپنے ہم عمر لوگوں کے ساتھ باتیں کرتے کچھ دور نکل گئے، بیٹھے بیٹھے اس کی نگاہ سڑک کنارے سے گزرتے ہوئے ایک فقیر پہ پڑی تو وہ اندر تک سہم گیا، جسم کو برف بنا دینے والی سردی میں اس کے بدن پر معمولی شرٹ اور پتلی سی چادر تھی، اپنے جسم کو سکوڑے وہ بری طرح کانپ رہا تھا، راہ چلتے پتہ نہیں کتنے مسافروں کی نظر اس پہ پڑی ہوگی، لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے کپکپاتی ہوئی سردی کی مار جھیلتے جھیلتے جسم کے ساتھ ساتھ لوگوں کے دل بھی برف ہو گئے ہوں، کسی کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ اس بے چارے فقیر کے بدن پر کوئی پرانا سا گرم کپڑا ہی ڈال دے۔ شہر کی بھیڑ بھاڑ میں انسانیت بھی کہیں گم ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔

صابر چھوٹا ضرور تھا، لیکن بہت رحم دل تھا، گھر پہ اگر کوئی مانگنے والا فقیر آ جاتا تو دوڑ کر اپنی ماں کو بولتا:

''مما مما..... پیسہ دو نا، فقیر بابا کو دوں گا۔'' اور اس کی ماں اس کی طرف پیار سے دیکھتی، مسکراتی اور اس کے ننھے ہاتھوں میں سکہ تھما دیتی اور وہ فقیروں کے ہاتھوں میں اُسے تھمانے کے بعد دعائیں لے کر صرف خوش ہی نہیں ہوتا بلکہ بعد میں بار بار اپنی امی سے کہتا:

''پتہ ہے مما بوڑھے فقیر بابا کہہ رہے تھے: تم بہت اچھے ہو، نیک ہو، اللہ تمہیں کامیاب کرے، بڑا بنائے۔ آمین۔ میں سچ میں بڑا بنوں گا کیا؟''

اس کی زبان سے اس طرح کی باتیں سن کر اس کی ماں بہت خوش ہوتی تھی، اس کی حوصلہ افزائی کرتی اور کہتی:

''ہاں بیٹا آپ بہت..... بڑے آدمی بنیں گے۔''

سڑک سے گزرتے اس فقیر کو دیکھ کر صابر کو ترس آ گیا، اس نے اس کو آواز دی، جب وہ قریب آیا تو اس نے ایک گرم کپڑا اپنے جسم سے اُتار کر فقیر کو دے دیا، اور فقیر اُسے پہن کر دُعائیں دیتا ہوا رُخصت ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد دھیرے قدموں سے چلتا ہوا صابر اپنے ابو کے پاس پہونچا تو اس کے ابو ایک گرم کپڑے سے اس کے جسم کو خالی دیکھ کر پوچھنے لگے:

''ارے بیٹا! وہ کپڑا کیا ہوا جو ٹھنڈ کی آمد پہ چند دنوں پہلے ہی میں نے آپ کو خرید کر دیا ہے؟''

صابر نے انتہائی معصومیت کے ساتھ جواب دیا:

''وہ تو میں نے اس فقیر کو دے دیا جو بری طرح ٹھنڈ سے کانپ رہا تھا، پاپا! آخر وہ بھی تو انسان ہی ہے نا؟! اسکول میں ہمارے اردو کے ٹیچر مولوی صاحب کہتے ہیں، مجبور اور محتاج لوگوں کی مدد کرنے سے اللہ بڑی بڑی آفتوں کو سر سے ٹال دیتا ہے۔''

اس کے ابو نے غصے سے دانت پیستے ہوئے کہا:

''بیٹا آپ کی بات تو صحیح ہے، لیکن اگر آپ اسی طرح راہ چلتے ہوئے فقیروں کو اپنا کپڑا نکال کر دیتے رہے تب تو ہو گئی میری چھٹی۔''

اس کے ابو چونکہ تھوڑے دنیا پرست آدمی تھے، ان کے اندر اس قسم کا کوئی نیکی کا جذبہ نہیں تھا، وہ بس اپنے آپ سے مطلب رکھنے والے انسان تھے، اسی لیے بیٹے کے اس جذبے کو قدر کی نگاہ سے دیکھنے کی بجائے اسے ڈانٹنے لگے بولے:

''بیٹا لگتا ہے گھر چل کر آج آپ کی اچھی طرح خبر لینی ہی پڑے گی۔'' صابر سمجھ گیا اس کا مطلب آج ابو میری پٹائی کریں گے، وہ

PDF Compressor Free Version

گردن جھکائے چپ چاپ باپ کی پھٹکار سنتا رہا۔اس کے بعد دونوں باپ بیٹے گھر کی طرف چل پڑے ،ابھی کچھ ہی دور کا فاصلہ طے ہوا تھا کہ ایک موڑ سے گزرتے ہوئے تیز رفتار ٹرک صابر کو دھکا مارتے ہوئے گزر گئی،صابر اوندھے منہ گرتے ہی بے ہوش ہو گیا، یہ منظر دیکھتے ہی اس کے ابو بری طرح چیخنے لگے:

''بچاؤ بچاؤ......میرے بیٹے کو بچاؤ''

آواز سن کر کچھ لوگ جمع ہو گئے،دس گز کی دوری پر ھاسپیٹل تھا، بیٹے کو کاندھے پر لادے اس کے ابو ھاسپیٹل کی طرف دوڑے، ڈاکٹر سے سارا ماجرا بیان کیا اور اپنے بیٹے کی زندگی بچانے کی فریاد کرنے لگے،ڈاکٹر صاحب نے کہا:

''آپ ہمت سے کام لیجیے میں اچھی طرح چیک اپ کر رہا ہوں، جیسے ہی اس کی طبیعت نارمل ہو گی آپ کو خبر کر دی جائے گی۔''

گھنٹوں بعد صابر کو ہوش آیا تو ڈاکٹر نے اس کے ابو سے کہا:

''آپ اپنے بچے کے بارے میں جس طرح کے حادثے کا ذکر کر رہے تھے اس حساب سے تو اسے کچھ بھی نہیں ہوا ہے...... بس !تھوڑا سا جسم پہ خراش ہے...... بقیہ اس کی پوری جسمانی حالت ماشاءاللہ ٹھیک ہے۔''

ڈاکٹر کی زبان سے یہ سب سن کر اس کے ابو کو یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ تھوڑی ہمت بندھی تو بیٹے کے قریب گئے۔ابو کو قریب پا کر صابر نے پھر اُسی معصومیت سے کہا:

''پاپا!......مجبوروں کی مدد کرنے سے بڑی بڑی مصیبتیں ٹل جاتی ہیں نا......؟''

بیٹے کی زبان سے یہ جملہ سن کر اس کے ابو نے کہا:

''ہاں بیٹا ہاں....تم صحیح کہتے ہو''اور اُن کی آنکھیں جرم کے احساس سے بھیگ گئیں۔

عزیز بچو!سچ بھی یہی ہے کہ بے بس ،لاغر و ناتواں کمزور لوگوں کی مدد کرنے سے اللہ انسان کو بڑی بڑی آفتوں سے بچا لیتا ہے، کیونکہ جب تک ہمارے سینوں میں انسانیت کا درد نہ ہو،ہمارے انسان ہونے کا کوئی معنی نہیں رہ جاتا ہے،آپ بھی اسکول جاتے اور آتے وقت ٹھنڈ کے اس موسم میں پتہ نہیں کتنے ایسے مجبور لوگوں کو دیکھتے ہوں گے اور نظر انداز کر کے گزر جاتے ہوں گے،لیکن یاد رکھیے کل قیامت کے دن اللہ ہم سے اس کے بارے میں بھی سوال کرے گا۔

اب پھر نہیں (ص ۷۵ سے آگے)

میدان میں کھیلتے بچوں نے اسے الٹی کرتے دیکھ لیا ماسٹروں کو خبر ہوئی تو انہوں نے فوری طور پر انوری بیگم کو فون کر کے بلا لیا وہ دوڑی دوڑی آئیں اور اسے ڈانٹتی ڈپٹتی ہوئی ڈاکٹر خانے لے گئیں۔راستے بھر روتی رہیں اور اس ضدی اور ناسمجھ بچے کے لئے ہدایت کی دعائیں بھی مانگتی رہیں۔

پکنک پر جانے والی گاڑی اپنے وقت پر کھل گئی،ذیشان کی آرزو دل ہی میں رہ گئی،امی کے آنسوؤں نے بڑا کام کیا۔ذیشان نے کان پکڑ کر معافی مانگی اور اب آئندہ ایسا نہ کرنے کا پکا وعدہ کیا۔

یاد رکھنے کی باتیں

- ☆ میٹھے بول غصہ کو کم کرتے ہیں،اس لئے شیریں زبانی اپناؤ
- ☆ خدمت سے راحت،عزت اور خوش قسمتی ملتی ہے
- ☆ صبر سب سے بڑی دعا ہے اور اس کا پھل میٹھا ہوتا ہے
- ☆ حکمت و دانائی مفلس کو بھی بادشاہ بنا دیتی ہے
- ☆ سکھ کا راز ایثار اور قربانی میں پنہاں ہوتا ہے
- ☆ برائی تھوڑی بھی بہت ہے،اس سے ہمیشہ بچتے رہو
- ☆ اللہ بہت بڑا ہے،اس کے فضل پر توکل کرو
- ☆ تلخ بات اس چیز میں بھی سوراخ کر دیتی ہے جس کو سوئی نہیں چھید سکتی،اس لئے تلخ کلامی سے ہمیشہ بچو
- ☆ اپنے ہر خیال اور ہر عمل میں نیک بنو
- ☆ بے صبری،صبر سے زیادہ تکلیف دہ بات ہے
- ☆ دوستی میں کبھی غرور کو جگہ نہ دو

PDF Compressor Free Version

شاذیہ حسن
Govt. Research Scholar, 32 N.C.M. Road, Chapdani Bazar
P.o. Chapdani, Distt Hoogly 712222 (W.B.)

باپ، بیٹا اور گدھا

میں نے یہ کہانی اپنے دادا سے سنی تھی، مگر آج بھی یہ اپنے موضوع کے لحاظ سے ایک انوکھی کہانی ہے۔ بہت پرانے زمانے کی بات ہے کسی گاؤں میں ایک باپ اور اس کا ایک بیٹا رہتا تھا۔ لڑکے کی ماں مر چکی تھی۔ باپ دھوبی تھا لوگوں کے گھر سے جا کر کپڑے لے آتا اور دن بھر اسے ندی میں دھوتا اور دھوپ میں سکھا کر صاف ستھرا کر کے تہہ لگا کر لوگوں کو واپس کر آتا۔ جو پیسے ملتے اسی میں دونوں باپ بیٹے کسی صورت گزارا کرتے۔ چونکہ ان کے پاس کپڑے ڈھونے کے لئے گدھا نہیں تھا اس لئے انہیں اور بھی تکلیف ہوتی تھی۔

ایک دن باپ نے بیٹے سے کہا کہ اگر ہم تھوڑا تھوڑا کر کے پیسے جمع کریں تو ایک گدھا ضرور خرید سکتے ہیں۔ پس وہ پیسہ جمع کرنے لگے اور آخر ایک دن ان کے پاس اتنے پیسے ہو گئے کہ وہ ایک گدھا خرید سکتے تھے۔ انہی دنوں ان کے گاؤں سے کچھ دور ایک میلہ لگا ہوا تھا دونوں باپ بیٹا میلے میں گئے اور دیکھ بھال کر ایک گدھا خرید لیا اور خوشی خوشی گھر کو روانہ ہو گئے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد انہیں کچھ لوگ ملے جو انہیں دیکھ کر کہنے لگے:

''لو دیکھو! ایسے بھی بیوقوف ہیں اس دنیا میں، سواری ساتھ میں ہے اور دونوں باپ بیٹے پیدل جا رہے ہیں۔'' بیٹے نے باپ کو گدھے پر بٹھا دیا اور خود پیدل چلنے لگا۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد انہیں پھر کچھ لوگ ملے اور انہیں دیکھ کر کہنے لگے:

''لو بھئی یہ دیکھو! تم نے ایسا باپ نہ دیکھا ہوگا جو خود تو مزے سے سواری کر رہا ہے اور معصوم بچہ پیدل گھسٹ رہا ہے۔''

باپ نے اپنی جگہ بیٹے کو گدھے پر بٹھایا اور خود پیدل ساتھ چلنے لگا۔ وہ ابھی تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ انہیں پھر کچھ لوگ ملے جو انہیں دیکھ کر کہنے لگے:

''بھئی گھور کلجگ آ گیا ہے۔ آج کی اولادوں میں تو جیسے بوڑھے بزرگوں کی کوئی عزت ہی نہیں ہے۔ یہ دیکھو بوڑھا باپ بے چارہ پیدل چل چل مرا جا رہا ہے اور بیٹا کس شان سے سواری کر رہا ہے۔

باپ نے یہ سنا تو خود بھی گدھے پر بیٹھ گیا اور گھر کی طرف چلنے لگا۔

کچھ اور دور چلنے کے بعد انہیں پھر کچھ لوگ ملے اور باپ بیٹا دونوں کو گدھے پر بیٹھا دیکھ کہنے لگے:

''کیا زمانہ آ گیا ہے، پیار محبت نام کی تو کوئی چیز ہی نہیں رہی، بے بس جانور پر بھی لوگ کیسے کیسے ظلم ڈھاتے ہیں۔ اب ان باپ بیٹے کو ہی لے لو، کیسے ایک جانور پر دونوں لدے ہوئے ہیں۔''

یہ باتیں سن کر دونوں باپ بیٹا گدھے سے نیچے اتر آئے۔

باپ نے اِدھر اُدھر دیکھا اسے ایک بانس نظر آیا۔ اس نے وہ بانس اٹھایا اور گدھے کے چاروں پاؤں اس بانس سے باندھ دئے اور دونوں باپ بیٹے نے مل کر اسے اپنے کاندھوں پر اٹھا لیا اور چلنے لگے اور کچھ دور جانے کے بعد پھر انہیں کچھ لوگ ملے جو انہیں دیکھتے ہی ہنسنے لگے اور کہنے لگے:

''یہ دیکھو! آج تک تو ہم نے گدھے پر انسانوں کو سفر کرتے دیکھا تھا آج پہلی بار انسانوں پر گدھے کو سفر کرتے دیکھ رہے ہیں۔''

باپ بیٹا اس وقت ایک پل پر سے گزر رہے تھے کہ گدھا اچانک چھٹپٹایا اور ان کے ہاتھوں سے چھوٹ کر نیچے ندی میں جا گرا۔

اس لئے بچو! آپ اپنا کام نہایت ہی سوچ سمجھ کر کیجئے اور لوگوں کی تنقید سے بددل مت ہو جائیے۔ لوگوں کا کیا ہے وہ تو ہر بات میں تنقید کرتے ہیں، جیسا کہ آپ نے اس کہانی میں پڑھا۔

PDF Compressor Free Version

کرشن پرویز

Kharar, Distt. Mohali 140301 (Pb.)

مشورہ

بچو جب بھی منھ تم کھولو
جو بھی بولو سوچ کے بولو

جو بھی کہنا ، پیار سے کہنا
سب سے اچھا میٹھا بولو

پیار محبت بانٹو سب میں
باتوں سے تم زہر نہ گھولو

وقت پہ سارے کام کرو تم
وقت پہ پڑھ لو وقت پہ سو لو

وقت بڑا انمول ہے بچو
تم یوں ہی بے کار نہ ڈولو

ڈاکٹر محمد زاہد

B-5, Prince Dilawarjah Lane, Kolkata 700024

جانوروں کی فریاد

کہتے ہیں سب مجھ کو شیر
سارے جانور مجھ سے زیر
میں تھا بہت نڈر
پر اب لگتا ہے ڈر
جو تھے میرے حواری
لے کر گئے شکاری
رہتا ہوں غمگین
بات ہے یہ سنگین
کس کے ساتھ میں کھیلوں اب
کس کے لئے میں گرجوں اب
میں ہوں ایک ہاتھی
جنگل میرا ساتھی
رہتا ہوں پریشان
کیوں کر کروں بیان
ہیں چڑیا گھر میں برخوردار
میرے سارے رشتہ دار
یاد بہت ہے آتی جن کی
کس سے کہوں میں اپنے من کی